



# پاکستان میں عبداللہ

## ڈاکٹر گام

پاکستان میں



عبداللہ..... جو میرے، تمہارے اور ہم سب کے اندر جانے کہاں چھپا بیٹھا رہتا ہے..... دور حاضر کا مقبول ترین ناول

عبداللہ

ہاشم ندیم

ڈاکٹ کام



## جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ

نام کتاب	عبداللہ
مصنف	ہاشم ندیم
ناشر	گل فرازا احمد
مطبع	علم و عرفان پبلشرز، لاہور
پروف ریڈنگ	زاہدہ نوید پرنٹرز، لاہور
کمپوزنگ	اکرم، شیر محمد طاہر
سن اشاعت	اکرم، انیس احمد
قیمت	جنوری 2011ء
	500/= روپے

..... ملنے کا پتہ .....

علم و عرفان پبلشرز

الحمد مارکیٹ، 40۔ اردو بازار، لاہور

فون 7232336-7352332-042

ادارہ علم و عرفان پبلشرز کا مقصد ایسی کتب کی اشاعت کرنا ہے جو تحقیق کے لحاظ سے اعلیٰ معیار کی ہوں۔ اس ادارے کے تحت جو کتب شائع ہوں گی اس کا مقصد کسی کی دل آزاری یا کسی کو نقصان پہنچانا نہیں بلکہ اشاعتی دنیا میں ایک نئی جدت پیدا کرنا ہے۔ جب کوئی مصنف کتاب لکھتا ہے تو اس میں اس کی اپنی تحقیق اور اپنے خیالات شامل ہوتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ آپ اور ہمارا ادارہ مصنف کے خیالات اور تحقیق سے متفق ہوں۔ اللہ کے فضل و کرم، انسانی طاقت اور بساط کے مطابق کمپوزنگ، طبعیت، تصحیح اور جلد سازی میں پوری احتیاط کی گئی ہے۔ بشری نقصان سے اگر کوئی غلطی یا صفحات درست نہ ہوں تو ازراہ کرم مطلع فرمادیں۔ انشاء اللہ اگلے ایڈیشن میں ازالہ کیا جائیگا۔ (ناشر)

انتساب!

عبداللہ کے نام

جو میرے، تمہارے اور ہم سب کے  
اندر جانے کہاں چھپا بیٹھا رہتا ہے

ڈاٹ کام

## فہرست

07	درگاہ (۱)	-1
12	درگاہ (۲)	-2
17	زہرا	-3
22	سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا	-4
27	محبت سی ہو گئی ہے	-5
32	نظر کی التجا	-6
37	رقیب	-7
42	پہلی کھوج کا خطر	-8
47	دور جنوں	-9
52	تین تاقی	-10
57	عبداللہ	-11
63	مختصر راہ	-12
68	من کی لگن	-13
73	تربیت	-14
79	پہلی جیت	-15
85	الوداع	-16
92	کالا پانی	-17
97	آخری انتظار	-18
103	آخری مجاہدہ	-19
109	عصا اور دیک	-20

## فہرست

116	یا قوط	-21
123	آسیب محبت	-22
130	صلیب عشق	-23
137	ابھی کچھ دیر باقی ہے	-24
146	داسن اور چنگاری	-25
153	سو دوزیاں	-26
159	درد اور مسیحا	-27
171	لا ریب	-28
177	دوسرا مسیحا	-29
184	فاصلے ساتھ چلتے ہیں	-30
189	چھلا وہ	-31
195	ایمان فروش	-32
202	تیسری رات	-33
209	معصوم قاتل	-34
216	پھر وہی محبت	-35
223	پہلی رہائی	-36
231	دوسری منت	-37
237	خوابوں کا بیوپاری	-38
244	خواب مرنے نہیں	-39



## درگاہ (۱)

ساحل کی طرف جاتی ہوئی مرکزی شاہراہ، جو عام حالات میں کسی جوان بیوہ کی اجڑی مانگ کی طرح بے رنگ اور سنسان پڑی رہتی تھی، اس وقت شہر کے امراء کی چند بگڑی ہوئی اولادوں کی خرمستیوں کی آماج گاہ بنی ہوئی تھی۔ فضا میں اسپورٹس کاروں اور ہیوی بانیکس کی چٹکھاڑتی آوازوں نے ایک بل چل اور طوفان سا برپا کیا ہوا تھا۔ معاملہ شہر سے ویران ساحل کی پٹی تک ریس کا تھا اور ہم میں سے کوئی بھی یہ ریس ہارنا نہیں چاہتا تھا۔ سب سے آگے صوبے کے ہوم سیکریٹری کے لاڈلے صاحب زادے وقار یعنی وکی کی مرسدیز اسپورٹس کار تھی۔ اس کے بعد ملک کے معروف صنعت کار بختیار احمد کی اکلوتی اولاد ساحر، یعنی میری منی جیکو اترتی اور میرے پیچھے صوبائی وزیر مالیات کا بگڑا شہزادہ کاشف اپنی دوست ردا کے ساتھ ہیوی بانیک پر فرائے بھرتا، مختلف گاڑیوں کے درمیان لہراتا اور اپنا راستہ بناتے ہوئے صرف چند انچ کے فاصلے سے میری گاڑی کے پچھلے قطر بیا چھوتا ہوا چلا آ رہا تھا۔ باقی دوست اُس کے ذرا فاصلے پر تھے۔ لوگ ہمیں دُور ہی سے دیکھ کر سر اسیمہ ہو کے ادھر ادھر اُچھل کر اپنی جان بچانے کے لیے بھاگ رہے تھے۔ وکی نے سڑک پار کرتے ہوئے ایک ٹھیلے کو ہلکا سا جھولیا۔ ٹھیلے والا ایک جانب کوکود اور اُس کے ٹھیلے سے نارمل فضا میں یوں اُچھلے جیسے کسی شہر بچے نے یک دم فضا میں بہت سے خاکستری غبارے چھوڑ دیئے ہوں۔ ان میں سے ایک نارمل کسی گرینیڈ کی طرح میری کار کی ونڈ اسکرین سے ٹکرایا اور شیشے پر اگلے ہی لمحے مڑی کے جالے جیسی رگیں ابھر آئیں۔ میرے ساتھ گاڑی میں بیٹھی گورنر کی جھتھی اور میری بہترین دوست عینی زور سے چلائی اور اس کے منہ سے انگریزی گالیوں اور مغلظات کا ایک طوفان وکی کی شان میں ابل پڑا۔ میرے پیچھے آتے ہوئے کاشف کی ایک سو پچاس کی اسپینڈ سے دوڑتی ہوئی بانیک کا پھیر نارمل کے اوپر چڑھ گیا اور بانیک فضا میں یوں اچھلے جیسے کسی توپ سے نکلا ہوا گولا..... لیکن کاشف نے اپنے حواس قابو میں رکھے اور بانیک کو زمین پر لگتے ہی ایک جانب کو جھکا کر اُلٹنے سے بچا لیا۔ البتہ اس کے پیچھے آتے ہوئے دو موٹر سائیکل سوار خود کو بچا نہیں پائے۔ سڑک پر دوور تک ان کی بانیکس کی پھسلنے کی آوازیں اور اسکرٹچیں گونجتی رہیں۔ شاید ریس میں شامل ایک آدھ کار بھی پھسلی لیکن میں مڑ کر دیکھ نہیں پایا، کیونکہ اس وقت میری ساری توجہ آگے سڑک پر دوڑتی وکی کی مرسدیز پر تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اب ساحلی پٹی صرف چند کلومیٹر ہی دور رہ گئی ہے، لہذا وہ اپنی گاڑی کو سڑک پر دونوں جانب لہراتے ہوئے آگے بڑھ رہا تھا تا کہ میری گاڑی کو آگے نکلنے کا کوئی راستہ نہ مل سکے۔ کاشف گاڑی کی کھڑکی سے ہاتھ نکال نکال کر مجھے اشتعال دلانے کے لیے مختلف اشارے بھی کر رہا تھا اور اس عمل میں اس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھی، اس کی ولایت پلٹ کزن ٹینا بھی برابر کا ساتھ دے رہی تھی، جو عینی کو مزید مشتعل کرنے کا باعث بن رہا تھا۔ آخری دس کلومیٹر کا بورڈ دیکھتے ہی عینی نے مایوسی سے سر ہلایا۔ ”نہیں ساحر..... اب ہم نہیں جیت سکتے..... فاصلہ بہت کم رہ گیا ہے۔ ہم ہار گئے ساحر..... ڈیم اٹ یار.....“ میں نے عینی کو کوئی جواب نہیں دیا اور گیر بدل کر ایکسپریس پر دباؤ بڑھا دیا۔ عینی بھی جانتی تھی کہ مجھے ہار سے کس قدر شدید نفرت تھی۔ میں نے ہارنا سیکھا ہی نہیں

تھا۔ ہم زندگی میں جیتنا سیکھیں، یا نہ سیکھیں، جیت ہمیں خود ہی سب سکھا دیتی ہے۔ ہاں! البتہ ہمارا قواعد سیکھنا پڑتا ہے کہ ہمارا آپ کو خود کچھ نہیں سکھاتی۔ لیکن میں خود فی الحال اس فن سے نا آشنا تھا اور کم از کم آج تو میں کسی صورت ہارنا نہیں چاہتا تھا کیونکہ مقابلے پر میرا ازلی حریف وہی تھا۔ اس ریس کا آئیڈیا کل رات ہی ہمارے شیطان دماغوں میں اس وقت آیا تھا جب ہم کلب کے نیلگوں دھوئیں بھرے ماحول میں اپنے اپنے ”بھرے“ ہوئے سگریٹ کے کش لگا رہے تھے۔ فضا میں دھوئیں اور بئیر کی ملی جلی خوشبو پھیلی ہوئی تھی اور دھواں کشید کرنے کے اس عمل میں ہم میں سے ہر ایک کا..... جوڑا بھی پورے شد و مد سے شریک تھا۔ صرف یعنی ہی اُن میں ایک ایسی لڑکی تھی جس کا دم اس مخصوص دھوئیں کی زیادتی سے گھٹنے لگا تھا اور تب وہ میرا ہاتھ پکڑ کر زبردستی مجھے کلب سے باہر کھلی فضا میں کھینچ لائی تھی۔ ”اُف ساحر..... کیوں پیٹے ہو یہ زہر..... نفرت ہے مجھے اس دھوئیں سے۔“ لیکن کل رات یعنی کی بات شروع ہونے سے پہلے ہی وقار نے بحث چھیڑ دی تھی کہ اُس کے باپ نے گزشتہ ہفتے ہی اسے جوینی اسپورٹس مرسڈیز لے کر دی ہے وہ اسے ڈھائی سو کی رفتار سے دوڑاتا ہوا کالج آ سکتا ہے۔ کاشف نے جڑ کر اسے ریس لگانے کا چیلنج دے دیا اور رفتہ رفتہ بحث نے اتنا طویل پکڑا کہ ہم سب ہی نے اس ریس میں شریک ہونے کا فیصلہ کر لیا اور اس کے نتیجے میں آج ہم سب کی گاڑیاں اور بائیکس اس ساحلی سڑک پر آگ اگتی ہوئی دوڑ رہی تھیں۔

ریس ختم ہونے والا پوائنٹ ساحل پر بنے ہوئے لکڑی کے ہٹس (Huts) کے عین سامنے جا کر ختم ہونے والی یہی کولتار کی سڑک تھی جہاں پہلے ہی سے یونیورسٹی کا پورا ایک گروپ جوم کی شکل میں چیخ چلا کے اور نعرے لگا کر ہمارا حوصلہ بڑھا رہا تھا۔ انہیں میں وہ دوڑ کے بھی موجود تھے جن کے ہاتھ میں سفید رومال تھے، جنہیں آخری جیت کی گواہی دینے کے لیے ہم نے بطور بیچ وہاں کھڑا کیا تھا۔ آخری پوائنٹ اب صرف دو کلو میٹر کی دوری پر رہ گیا تھا اور ہماری اسپورٹس کاریں جس رفتار سے دوڑ رہی تھیں، اس حساب سے یہ دو کلو میٹر صرف دو لمحوں کی دوری پر تھے۔ وہی کسی صورت مجھے آگے نکلنے کا موقع نہیں دینا چاہتا تھا اور مجھے بس ایک لمحوں کی تلاش تھی اور پھر وہ لمحہ ایک اونچے ریت کے ٹیلے کی صورت میں مجھے نظر آئی گیا۔ سڑک کے اختتام سے کچھ قدم پہلے سڑک کی بائیں جانب ریت کچھ اس طرح اکٹھی ہو گئی تھی کہ ایک اونچا سا ٹیلہ بن گیا تھا۔ میں نے گیس بدلا اور چلا کر یعنی سے کہا۔ ”سیٹ بیلٹ اچھی طرح کس لو.....“ یعنی نے شاید میری آنکھوں میں لپکتی چمک کو دیکھ لیا تھا۔ وہ سراسیمہ ہو کر چلائی ”نہیں ساحر..... پلیز.....“ فارا گڈ سیک ساحر۔“ لیکن یعنی کی چیخ اس کے گلے ہی میں گھٹ کر رہ گئی اور میری جیگوار ریت کے ٹیلے پر یوں چڑھی جیسے کوئی گلائڈ رائونجی اڑان اڑنے سے پہلے کسی اونچے پہاڑ کی چوٹی پر بنی چٹان پر دوڑتا ہے اور اگلے ہی لمحے میری گاڑی بھی کسی شاہین کی طرح فضا میں تیرتی ہوئی اختتامی حد پر لگے ہوئے سرخ جھنڈے کو کراس کر گئی۔ فضا میں تیرتے ہوئے میری نظر نیچے دوٹ جیچھے آتی مرسڈیز میں بیٹھے وہی پر پڑی، جس نے جھنجھلاہٹ میں اپنا سر زور سے اسٹینڈنگ پر دے مارا تھا۔ میری جیگوار ایک زوردار آواز اور شدید جھٹکے کے ساتھ نیچے پرتلے ساحل سے ٹکرانی اور اس کے اگلے دونوں ناز زوردار دھماکے کے ساتھ برسٹ ہو گئے۔ کار زور سے لہرائی لیکن اس کے اٹنے سے پہلے ہی میں نے پوری قوت کے ساتھ ہینڈ بریک کھینچ لی۔ لیکن گاڑی کے ہونٹ سے نکلتے ہوئے دھوئیں اور گاڑی کے فریم کو دیکھ کر کوئی اتار ڈی مستری بھی یہ بتا سکتا ہے کہ اب یہ کار کم از کم میرے کسی کام کی نہیں رہ گئی۔ مجھے اپنی پسندیدہ گاڑی کے تباہ ہو جانے کا کوئی دکھ نہیں تھا۔ خوشی تو اس بات کی تھی کہ میں نے ایک بار پھر وہی کوہرا دیا تھا۔ ہینڈ بریک کھینچنے کی وجہ سے گاڑی نے



گھومتے ہوئے ریت کا جو طوفان اٹھایا تھا وہ اب ختم چکا تھا..... یعنی، جس نے کار کے اڑان بھرتے ہی اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا تھا، نے اپنا چہرہ اوپر اٹھایا اور ایک تیز جھرجھری لے کر بولی ”تم بالکل پاگل ہو سارہ..... یو آر ٹوٹلی میڈ“ میں نے عینی کی طرف ایک مسکراہٹ بھری نظر ڈالی اور گاڑی سے نیچے اتر آیا۔ سب دوستوں نے مجھے گھیر لیا تھا اور سب ہی شور مچا رہے تھے۔ دور کی کھڑا چلا رہا تھا کہ مقابلہ زمین پر گاڑی دوڑانے کا تھا نہ کہ فضا میں اڑانے کا۔ لیکن کوئی اس کی بات نہیں سن رہا تھا اور کبھی اس سے شرط ہارنے کی رقم کا مطالبہ کر رہے تھے۔

ہم سب کا تعلق ایسے خاندانوں سے تھا جہاں ایسی معمولی رقم روزانہ گھر کے نوکروں میں بانٹ دی جاتی تھی، لیکن اس رقم کی حیثیت سب سے الگ تھی، کیونکہ یہ میری جیت کی رقم تھی..... تبھی میں نے اس حقیر رقم کے لیے اپنی لاکھوں روپے کی نئی امپورٹڈ گاڑی تباہ کر دی تھی اور سچ یہ ہے کہ اپنی ہر جیت کے لیے میں ساری زندگی روزانہ ایسی کئی گاڑیاں تباہ کرنے کے لیے تیار ہوں۔

میں ان سب کوڑتا جھگڑتا چھوڑ کر ایک اونچی چٹان پر بنے پتھر کے بچ پر جا کر بیٹھ گیا اور دور سے آتی لہروں کو چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش ہوتے دیکھنے میں مشغول ہو گیا۔ میری شخصیت میں ایک عجیب تضاد بھی تھا کہ ہر جیت، فتح کے فوراً بعد میرے لیے اپنی اہمیت کھودیتی تھی۔ سو، آج بھی یہی ہوا۔ ابھی چند لمبے پہلے میں نے جس جیت کے لیے اپنے ساتھ ساتھ اپنی عزیز از جان دوست یعنی کی زندگی بھی داؤ پر لگا دی تھی، اب میرے لیے ماضی بن چکی تھی اور مجھے اس فتح کی ٹکرا سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ میں نے نیچے یعنی گروپ اور کی کوڑتے جھگڑتے دیکھا اور اکتا کر سنگریٹ سلگائی۔ دفعہ دھوئیں کے نیلے مرغولے کے درمیان سے ہوتی میری نظر دور سڑک پر دوڑتی ہوئی کالے رنگ کی بڑی سی شیور لیٹ کار پر پڑی۔ اچھی گاڑیاں بچپن سے میری کمزوری تھیں اور جو لوگ کاروں کے بارے میں تھوڑا بہت علم رکھتے ہیں وہ یہ بھی ضرور جانتے ہوں گے کہ شیور لیٹ کو کاروں کی شہزادی کہا جاتا ہے، اور نئے ماڈل کی یہ شہزادی تو اب ہمارے ہاں تقریباً ناپید ہو گئی ہے۔ میری تمام تر توجہ اس شان دار گاڑی کی جانب مبذول ہو چکی تھی، جواب ساحل کے کنارے موجود پہاڑی سلسلے کے اندر تراشی ہوئی سفید پتھری میڑھیوں کے قریب آ کر رک چکی تھی۔ گاڑی میں سے کچھ لوگ اتر کر ان سنگی میڑھیوں کی جانب بڑھ گئے جن کا اختتام پہاڑی کی چوٹی پر بنی ہوئی ایک درگاہ کے وسیع صحن میں جا کر ہوتا تھا۔ میں اس کار سے بہت دور ایک دوسری پہاڑی چٹان پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس لیے میں کار کی سواریوں اور ان کے حلیے پر زیادہ غور نہیں کر سکا۔ بہر حال یہ بات میرے لیے کافی حیران کن تھی کہ اس جدید دور میں بھی ایسے اونچے طبقے کے لوگ ایسی درگاہوں پر حاضری دینے کے لیے آتے تھے؟ ہم انسانوں نے خود کو تسلی دینے کے لیے کیسے کیسے بہانے تراش رکھے ہیں..... اچانک میرے دل میں اس گاڑی کو قریب سے دیکھنے کی شدید خواہش ابھری۔ ویسے بھی میں یہاں بیٹھا بیٹھا اکتا نے لگا تھا۔ میں نے چٹان سے نیچے ساحل کی جانب نظر دوڑائی تو سبھی کو مشغول پایا۔ کوئی باربی کیو کی تیاری کر رہا تھا، تو کوئی اپنی گاڑی سے بڑے دیو قامت اسپیکر اور میوزک سسٹم اتار رہا تھا۔ یعنی نے دور سے ہاتھ ہلا کر مجھے نیچے آنے کا اشارہ کیا۔ میں نے جواباً اسے اشارہ کیا کہ میں ذرا گھوم کر آتا ہوں۔ چٹان سے دوسری جانب اترنے کے بعد میں ساحل کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا دوسری پہاڑی کے قریب پہنچ چکا تھا۔ وہ کار اب بھی وہیں کھڑی تھی اور ایک باوردی شو فراس کا بوٹ اٹھائے ریڈی ایٹر میں پانی ڈال رہا تھا۔ کہتے ہیں، سواری بھی انسان کی نفاست کو جا چٹنے کا ایک ذریعہ ہوتی ہے اور اس قول کی پرکھ اگر اس گاڑی سے کی جاتی تو یقیناً اس کا مالک انتہائی نفیس شخصیت کا مالک ہونا چاہئے تھا، کیونکہ گاڑی کو

بڑے سلیقے سے سنبھالا گیا تھا۔ میں کچھ دیر دل چسپی سے گاڑی کو دیکھتا رہا۔ اتنے میں ڈرائیور نے میری محویت نوٹ کر لی اور مسکرا کر بولا ”کیوں صاحب..... کیا دیکھ رہے ہیں..... گاڑی پسند آگئی ہے کیا؟“ میرے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ پھیل گئی۔ ”گاڑیوں کا کوئی بھی شوقین پہلی ہی نظر میں اس گاڑی کا عاشق ہو سکتا ہے۔“ ڈرائیور میری بات سن کر کھلکھلا کر ہنس دیا اور فخر سے بولا۔ ”سچ کہا آپ نے..... دراصل ہمارے سینئر صاحب نے بھی ساری عمر میں یہی ایک شوق پالا ہے۔ بلکہ انہیں تو اعلیٰ سے اعلیٰ گاڑی رکھنے کا جنون ہے۔ اب اسی گاڑی کو دیکھ لیں۔ پچھلے مہینے ہی امریکا سے منگوائی ہے۔ ہمارے صاحب کو جاپانی گاڑیاں بالکل بھی پسند نہیں ہیں کہ جاپان والوں نے گاڑیوں کو چھوٹا کر کے ان کی توہین کی ہے۔“

ڈرائیور بات کرتے کرتے آہٹ پا کر اچانک مودب سا ہو گیا اور جلدی سے بونٹ بند کر کے پیچھے دروازے کی جانب لپکا۔ میں نے چونک کر ڈرائیور کی نظر کے تعاقب میں اوپر جاتی سیڑھیوں پر نظر ڈالی اور چند لمحوں کے لیے مہبوت سا رہ گیا۔ اوپر سے ایک ادھیر عمر عورت کے ساتھ ایک پری رخ ماہ جہیں دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی سیڑھیاں اتر رہی تھی۔ اس کی چال میں ایک ایسا وقار تھا گویا کوئی راج ہنسنی پانی میں تیر رہی ہو۔ عورت اور لڑکی دونوں نے خود کو مناسب حد تک بڑی چادروں سے ڈھانپ رکھا تھا اور اس عشوہ طراز نے اپنے رخ پر باریک نقاب کی تہ بھی ڈال رکھی تھی۔ لیکن سچ تو یہ ہے کہ اس کا لے نقاب نے اس کے چہرے کا نور کہیں زیادہ بڑھا دیا تھا۔ ایسا نہیں تھا کہ میں اس سے پہلے حسن سے آشنا تھا، لیکن کچھ چہرے ایسے بھی ہوتے ہیں جو حسن اور مصہویت کو نئی تعریف اور نئے معنی دے جاتے ہیں۔ وہ چہرہ بھی ایسا ہی اور لاکھوں میں ایک تھا۔ ڈرائیور نے بھاگ کر دونوں پچھلے دروازے کھول دیئے تھے۔

لڑکی نے نظر اٹھا کر بھی میری طرف نہیں دیکھا اور اک شان بے نیازی سے چلتی ہوئی جا کر گاڑی میں بیٹھ گئی۔ ڈرائیور نے جلدی سے گاڑی کے دروازے بند کیے اور گاڑی ایک جھٹکے سے آگے بڑھ گئی۔ تبھی مجھے بھی جیسے ایک جھٹکا سا لگا اور میں اپنے حواس میں واپس آ گیا، لیکن تب تک کار کافی دور جا چکی تھی۔ مجھے خود پر شدید غصہ آیا۔ ایسی بھی کیا بے خودی؟ کم از کم مجھے گاڑی کا نمبر تو نوٹ کر لینا چاہئے تھا۔ اس وقت میں خود اپنی اس عجیب سی بے چینی اور کچھ کھودینے کی کٹک کو کوئی بھی نام دینے سے قاصر تھا۔ میں نے زور سے سر کو یوں جھکا جیسے خود کو ان بے حد اوس اور ساکت جھیل جیسی آنکھوں کے سحر سے آزاد کروانے کی کوئی ناکام سی کوشش کی ہو۔

اچانک ہی میری نظر پہاڑی کی چوٹی پر پڑی اور میرے قدم خود بخود ان پتھریلی سیڑھیوں کی جانب بڑھ گئے، جن کا اختتام اوپر بنی درگاہ پر ہوتا تھا۔ شاید میرے دل میں کہیں نہ کہیں یہ خواہش چل اٹھی تھی کہ آخرا ایسی کیا بات ہے اس پتھر کی بنی سفید اور سادہ سی عمارت میں، جس کی زیارت کے لیے اس گل رخ کے کول قدم اتنی دور تک اٹھے تھے۔ دور سے دیکھنے میں وہ درگاہ اتنی اونچائی پر نظر نہیں آتی تھی، لیکن جب میں آخری سیڑھی چڑھ کر درگاہ کے صحن میں پہنچا تو پسینے سے شرابور اور ہانپ رہا تھا۔ وہاں خاصے زائرین موجود تھے، جو اپنے طور پر اپنی اپنی منتوں کی قبولیت کے لیے کچھ نہ کچھ تدبیر کر رہے تھے۔ کوئی پھولوں کی چادر چڑھا رہا تھا، تو کوئی لنگر خانے میں دیکھیں کھلوائے بھوکوں کو کھانا کھلا رہا تھا۔ ایک جانب ایک حاجی صاحب دودھ میں زعفران اور روح افزا گھولے اپنی سکیل چلا رہے تھے۔ ایک جانب چند افراد مورچیل لیے درگاہ کے اندرونی حصے کی صفائی کر رہے تھے۔ مجھے ایک لمحے کو یوں لگا کہ جیسے جس کا گناہ جتنا بڑا ہے وہ اسی حساب سے کفارہ ادا کرنے کی سعی میں لگا ہوا ہے۔ لیکن کیا یہ سب کچھ کرنے سے



ہم انسانوں کی منتیں پوری ہو جاتی ہوں گی.....؟ کفارے ادا ہو جاتے ہوں گے.....؟ میں اپنی سوچوں میں غلطیاں کھڑا تھا کہ اچانک میرے عقب سے ایک بھاری لیکن ملائم سی آواز ابھری ”کیا میں آپ کی کچھ مدد کر سکتا ہوں.....؟“ میں چونک کر پلٹا۔ میرے سامنے میری ہی عمر کا ایک نوجوان ہاتھ میں تسبیح اور ہونٹوں پر ایک میٹھی سے مسکراہٹ لیے کھڑا تھا۔ سفید رنگ کے کرتے شلوار میں ملبوس اور چہرے پر کالی گھنی شرعی داڑھی خوب فٹج رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ایک خاص چمک اور لہجے میں عجیب سی مٹھاس تھی۔ میں نے مسکرا کر جواب دیا۔ ”جی..... بہت شکریہ..... میں بس یونہی اس طرف چلا آیا تھا..... آپ کی تعریف.....؟ تعریف کے لائق تو کچھ بھی نہیں ہے میرے پاس..... ہاں البتہ تعارف کے لیے نام ”عبداللہ ہے.....“



**We at Paksociety.com giving you the facility to download urdu novels,Imran series,Monthly digests with direct links and resumeable direct link along with the facility to read online on different fast servers**

**If site is not opening .or you find any issue in using site send your complaint at admin@paksociety.com**

**or**

**send message at  
0336-5557121**



## درگاہ (۲)

میں نے عبداللہ کا بڑھا ہوا ہاتھ تمام کر مصافحہ کیا۔ اس نے بات جاری رکھی۔ ”اسی درگاہ کا ایک مجاہد ہوں..... خدمت کرتا ہوں یہاں آنے والے زائرین کی.....“ میں نے غور سے عبداللہ کی جانب دیکھا ”آپ اپنی گفتگو سے تو پڑھے لکھے لگتے ہیں..... پھر یہ سب کچھ.....“ میں نے جان بوجھ کر اپنی بات اُدھوری چھوڑ دی۔ وہ میری بات سن کر ہلکے سے مسکایا۔ ”شاید آپ بھی پڑھائی کا مقصد صرف کسی سرکاری نوکری کا حصول ہی سمجھتے ہیں۔ ویسے میں نے بھی کچھ صفحے سیاہ تو کیے تھے لیکن یہاں آ کر پتا چلا کہ اب تک صرف وقت ہی ضائع کرتا رہا۔ بہر حال آپ بتائیے..... میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں.....؟“ ”نہیں کچھ نہیں..... دراصل میرے دوست نیچے ساحل پر میری راہ تک رہے ہوں گے..... آپ سے مل کر اچھا لگا.....“ میں نے عبداللہ کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے دبا یا اور واپسی کے لیے پلٹا..... پیچھے سے عبداللہ کی آواز سنائی دی۔ ”کوئی منت نہیں مانگیں گے آپ.....؟“ میں مسکرا کر پلٹا ”چلیں یہ وعدہ رہا..... جب کبھی کوئی منت مانگی ہوئی تو یہیں آپ کی اسی درگاہ میں کر مانگوں گا۔ اُمید ہے ششوائی ہوگی.....“ میری بات سن کر عبداللہ بھی مسکرا دیا ”مجھے انتظار رہے گا.....“ میں اس کی جانب الوداعی انداز میں ہاتھ لہرا کر سیڑھیاں اتر گیا۔ نیچے وہ سبھی میرے لیے فکر مند ہو چکے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی سب سے پہلے عینی برس پڑی۔ ”ساحر..... یہ کیا مذاق ہے.....؟ تم جانتے ہو ہم سب یہاں تمہاری وجہ سے کس قدر ہلکان ہو رہے تھے..... کہاں چلے گئے تھے تم..... کچھ ہمارا بھی خیال ہے تمہیں.....“ وہ رو ہانسی ہی ہو کر چپ ہو گئی۔ میں نے ان سب کے سامنے ہاتھ جوڑے ”معاف کر دو یار..... میرا ارادہ اتنی دیر لگانے کا نہیں تھا..... بس دیر ہو ہی گئی..... میں دوسری پہاڑی کی چوٹی پر بنی درگاہ دیکھنے کے لیے چلا گیا تھا۔“ میرے منہ سے ”درگاہ“ کا نام سنتے ہی وہ سب یوں اچھلے جیسے میں نے ان کے عین سامنے کوئی بم پھوڑ دیا ہو۔ ”درگا.....؟ ساحر تم.....؟“ ”خیریت تو ہے نا۔“ ان سب کی حیرت بجا تھی۔ ہم میں سے وہاں ایسا کوئی بھی نہ تھا جس نے آج تک درگاہ تو کیا ”عید گاہ“ کی بھی کبھی زیارت کی ہو۔ ہم وہ تھے جن کے لیے لوگ منتیں مانگتے تھے، ہمیں بھلا ایسی جگہوں سے کیا واسطہ.....؟ ہم تو خود ایک ”منت“ کے طور پر اس دنیا میں وارد ہوئے تھے۔ جنہیں بن مانگے ہی اس جہاں میں سب کچھ میسر تھا۔ پھر ہمیں کیا ضرورت تھی، ان درگاہوں اور مسجدوں میں مانتا کینے کی.....؟ ہم سے تو ہمارا خدا ویسے ہی سدا کے لیے راضی تھا۔

میں نے جرمانے کے طور پر اسی رات سب ہی کو ہالینڈے ان میں ڈنر کی دعوت دی، تب جا کر ان لوگوں کا غصہ ٹھنڈا ہوا۔ لیکن عینی ابھی تک روٹھی روٹھی سی تھی۔ وہ مجھ پر دوسروں سے کہیں زیادہ اپنا حق سمجھتی تھی اور اسی حق کا مان اسے یوں روٹھنے پر مجبور بھی کرتا تھا۔ عینی کی یہ خاموشی واپسی پر بھی تمام راستے برقرار رہی۔ لیکن میں جانتا تھا کہ حسب معمول آدھی رات کو مجھے فون کئے بنا اسے نیند نہیں آئے گی، لیکن اس رات تھکن کی وجہ سے میں اس قدر گہری نیند میں تھا کہ نہ جانے کتنی گھنٹیوں کے بعد فون اٹھایا۔ دوسری جانب سے عینی کی پریشان اور کسی قدر جھنجھلائی ہوئی آواز

ابھری ”اتنی دیر کیوں لگا دی فون اٹھانے میں.....؟“ اس کی منجھلاہٹ پر مجھے ہنسی آ گئی۔ ”ابھی چند گھنٹے پہلے ہی تم نے درجنوں لوگوں کی موجودگی میں یہ عہد کیا تھا کہ اب آئندہ تم مجھ سے کبھی بات نہیں کرو گی۔“ ”تم جانتے ہو نا میں تم سے بات کئے بنا نہیں رہ پاؤں گی..... اسی لیے اتنا کڑتے ہو.....؟“ ”یاری میری کیا مجال کہ میں گورنر صاحب کی اکلوتی بیٹیجی کے سامنے ڈرامی بھی اکر دکھانے کی جرأت کر سکوں.....؟ مجھے نیل جانے کا کوئی شوق نہیں ہے۔“ مذاق مت کرو ساحر..... میں بے حد سنجیدہ ہوں۔“ میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ ”اچھا بولو..... کیا چاہتی ہو۔“ دوسری جانب سے عینی کی شرارت بھری آواز ابھری ”تمہیں.....“ ”اچھا..... تو یہ تم سنجیدہ ہو.....؟“ عینی نے ایک ٹھنڈی سے آہ بھری ”یہی تو مسئلہ ہے..... تم نے کبھی میری محبت کو سیریس لیا ہی نہیں.....“ ”عینی پر ایسے دورے مہینے میں ایک آدھ بار ضرور پڑتے تھے اور لگتا تھا کہ آج کی رات پھر انہی راتوں میں سے ایک تھی جب ہماری زوردار بحث ہونے والی تھی، لیکن آج میں اس سے بحث کے موڈ میں بالکل بھی نہیں تھا۔“ ”اوہ کم آن عینی..... تم جانتی ہو کہ میں یہ محبت وغیرہ پر بالکل یقین نہیں رکھتا..... محبت صرف جسم کے حصول کی درخواست کا ایک مہذب ذریعہ ہے..... بس ایک لفظ ہے، اپنی خواہشات پر پردہ ڈالنے کے لئے..... اور کچھ بھی نہیں.....“ وہ میری بات سن کر چپ سی ہو گئی۔ پھر آہستہ سے بولی ”میں تو تمہیں یہ دعا بھی نہیں دے سکتی کہ تمہارے دل کی بغیر زمین پر یہ خود رو پودا لگ جائے اور اس کے کانٹے تمہاری روح کو بھی اپنی کاٹ اور جھن سے زخمی کر دیں..... تمہارا تصور نہیں ہے ساحر..... شاید یہ میری آزاد خیالی ہی میرے جذبے کو بے وقت کرنے کا باعث بنتی ہے..... سویٹ ڈریمز.....“ عینی نے فون کاٹ دیا۔ میں حیرت سے فون کو دیکھ رہا تھا۔ اس لڑکی کو کیا ہو گیا ہے اچانک..... آج سے پہلے تو کبھی اس نے اس قدر ٹوٹے ہوئے لہجے میں مجھ سے بات نہیں کی تھی۔ پھر میں نے خود ہی اپنے دل کو تسلی دی کہ شاید شام کی بیڑ نے اپنا اثر اس وقت دیرات کو دکھانا شروع کیا ہو گا۔ میں نے کروٹ لی اور پھر آنکھیں دھیرے دھیرے بند ہوتی چلی گئیں۔

اگلے چند دن تک میں ہر بڑی امریکن گاڑی کو دیکھ کر نہ جانے کیوں چونک سا جاتا تھا اور میری نظریں دور تک اس گاڑی کا پیچھا کرتی رہتیں، لیکن مجھے وہ بڑی شیور لیٹ دوبارہ نظر نہیں آئی۔ پتا نہیں، وہ اس شہر میں رہتے بھی تھے، یا پھر کہیں اور سے اس درگاہ کی حاضری کے لیے آئے تھے۔ میں خود بھی نہیں جانتا تھا کہ میری اس بے چینی کی اصل وجہ کیا تھی اور پھر سب سے پہلے کاشف نے میری یہ ”کار یا ترا“ محسوس کر لی اور چوتھے دن اس نے مجھ سے آخر کار پوچھ ہی لیا۔ ”کیا بات ہے یار..... یہ آج کل ہر بڑی امریکن گاڑی کو دیکھ کر تم اس کے پیچھے ہی کیوں پڑ جاتے ہو.....؟“ میں نے اس روز درگاہ پر ہونے والی تمام واردات اسے تفصیل سے سنا دی۔ ”اوہو..... تو یہ بات ہے..... اب سمجھا..... میرا بار دراصل گاڑی نہیں، بلکہ گاڑی والی کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ یار کسی کو تو بخش دیا کرو..... جو حلیہ تم نے اس لڑکی کا ابھی ابھی بیان کیا ہے، اس سے ایک بات تو کنفرم ہے کہ شی ازناٹ پورٹا ہے۔“ ”اوہ شٹ اپ یار..... ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ مجھے صرف ایک تجسس ہے کہ آخر اس شہر میں ایسی کون سی فیملی ہے جو میری طرح گاڑیوں کا شوق رکھتی ہے، لیکن میں اس سے واقف نہیں ہوں.....“ کاشف بولا ”یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ لوگ اس شہر سے تعلق ہی نہ رکھتے ہوں..... کہیں اور کسی دوسرے شہر سے وہاں آئے ہوں.....؟“ یہی تو اچھن ہے کہ یہ بات کیسے معلوم کی جائے کہ وہ لوگ کہاں سے آئے تھے..... پتا نہیں کیوں..... لیکن میں اس لڑکی کی اداس آنکھوں میں چھپی داستان پڑھنا چاہتا تھا..... لیکن افسوس پڑھ نہیں پایا.....“ کاشف کچھ دیر تک غور سے



میری جانب دیکھتا رہا، پھر ایک دم اچانک کھڑا ہو گیا۔ ”چلو اٹھو۔۔۔۔۔“ کہاں۔۔۔۔۔“ آؤ اس آنکھوں کی کہانی کا راز جاننے کے لئے۔۔۔۔۔ چلو اب دیر نہ کرو۔“ میں کاشف کی عادت سے واقف تھا۔ ایک بار جو بات اس کے ذہن میں بیٹھ جاتی تھی پھر اسے نکالنا ہم میں سے کسی کے بھی بس کی بات نہیں تھی۔ کچھ ہی لمحوں بعد کاشف کی چڑو کی جیپ تیزی سے اسی سڑک پر رواں تھی جو اسی ویران ساحل کی پٹی کی جانب جاتی تھی، جہاں وہ درگاہ واقع تھی۔ کاشف نے جیپ بالکل سیڑھیوں کے قریب لا کر کھڑی کر دی۔ میں نے حیرت سے اس کی جانب دیکھا ”ہم یہاں کیوں آئے ہیں۔۔۔۔۔؟“ ”تمہیں وہ گاڑی نہیں نظر آئی تھی نا۔۔۔۔۔ تو اگر ہمیں اس گاڑی کا کوئی سراغ مل سکتا ہے تو وہ یہیں سے ملے گا۔۔۔۔۔ چلو اور درگاہ میں چل کر کچھ سن گن لینے گی کوشش کرتے ہیں۔“ میرے پاس کاشف کی بات مان لینے کے سوا اور کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ ہم دونوں تیزی سے سیڑھیاں پھلانگتے ہوئے درگاہ کے صحن تک جا پہنچے۔ باہر بیٹھے ایک مجاور نے ہمیں جوتے اتارنے کا اشارہ کیا۔ جوتے اتارتے ہوئے میں کچھ یاد کر کے چونک سا گیا۔ اس روز بیچڑ کی وجہ سے شاید اس دروازے پر بیٹھے مجاور کی مجھ پر نظر نہیں پڑ سکی تھی، لہذا میں جوتوں سمیت ہی درگاہ کے صحن میں داخل ہو گیا تھا۔ مجھے تو ان آداب کا کچھ پتا ہی نہیں تھا، لیکن عبداللہ کی نظر تو میرے جوتوں پر ضرور پڑی ہوگی۔ تو پھر آخراں نے مجھے جوتے اتارنے کا کیوں نہیں کہا۔۔۔۔۔؟ میں اسی سوچ میں گم کاشف کے پیچھے پیچھے درگاہ کے صحن میں داخل ہو گیا۔ کاشف نے دھیرے سے میرے کان میں کہا۔ ”میں درگاہ کے متولی سے اس گاڑی کا سراغ لگانے کی کوشش کرتا ہوں، تم یہیں ٹھہرو۔“ میں جانتا تھا کہ کاشف ایسے معاملات میں پیسے کی طاقت پر یقین رکھتا تھا۔ وہ ضرور متولی کے ہاتھ پر ہزار روپے رکھے گا اور اس سے معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرے گا۔ کاشف تیزی سے درگاہ کے پچھلے دروازے سے نکل کر کسی جانب عائب ہو گیا۔

میں نے گہری سانس لی اور پینل کے پیڑوں کے نیچے رکھے پانی کے گھڑوں کی جانب بڑھ گیا۔ اچانک ہی پیڑوں کے پیچھے سے عبداللہ آتا دکھائی دیا۔ اس کے ہاتھ میں چھوٹا سا نوادہ تھا۔ شاید وہ پھولوں کو پانی دے کر واپس آ رہا تھا۔ ہم دونوں کی نظریک وقت نکل گئی۔ عبداللہ نے خوش دلی سے میرا استقبال کیا۔ ”ارے آپ۔۔۔۔۔؟ کیا میں یہ سمجھوں کہ منت مانگنے کا وقت اتنی جلدی آ گیا۔۔۔۔۔؟“ میں ہنس دیا ”نہیں۔۔۔۔۔ ابھی وہ وقت نہیں آیا۔۔۔۔۔ دراصل کسی کی کھوج مجھے دوسری بار یہاں تک کھینچ لائی ہے۔“ عبداللہ نے غور سے میری جانب دیکھا ”میں دعا کروں گا کہ آپ کی کھوج تشہ نہ رہے۔۔۔۔۔“ ”تھینک یو۔۔۔۔۔ ویسے ایک بات کہوں، گر بری نہ لگے۔۔۔۔۔ ہم دونوں ہی تقریباً ہم عمر ہیں اور آپ جناب کے چکر میں پڑ کر ہم خواہ مخواہ ہی تکلف کے دھاگوں سے بندھے جا رہے ہیں۔ اگر ہم دونوں ایک دوسرے کو تم کہہ کر مخاطب کریں تو میں بہت ایزی محسوس کروں گا۔۔۔۔۔“ عبداللہ مسکرایا۔ ”چلو ایسا ہی سہی۔۔۔۔۔ لفظ اور القاب تو صرف اظہار کا ایک ذریعہ ہوتے ہیں۔“ ”ایک بات بتاؤ۔۔۔۔۔ اس دن پہلی مرتبہ جب میں اس درگاہ تک آیا تھا تو اپنی لاعلمی کی وجہ سے جوتے اتارنا بھول گیا تھا، لیکن تم نے میرے جوتے دیکھ کر بھی مجھے اتارنے کو نہیں کہا۔۔۔۔۔ کیوں۔۔۔۔۔؟ کیا تم نہیں سمجھتے کہ اس طرح ان جانے ہی میں سہی، پر میں نے درگاہ کے فرش کی بے حرمتی کی تھی۔۔۔۔۔؟“ ”فرش تو پھر سے دھل سکتا ہے، سودھو لیا گیا تھا، لیکن مجھے یہ اچھا نہیں لگا کہ تمہیں تمہاری پہلی حاضری پر ہی نوک دوں۔“ مجھے حیرت ہوئی کہ یہ کیسا مجاور ہے جو اپنی درگاہ کے فرش سے زیادہ دلوں کے میلے ہونے کو اہم گردانتا ہے۔۔۔۔۔؟ میں نے غور سے عبداللہ کی جانب دیکھا۔ ”تم اپنے طور و اطوار سے کسی بھی طرح اس درگاہ کے مجاور نہیں لگتے،



کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ تم یہاں تک کیسے پہنچے؟“ عبداللہ کے چہرے پر اس کی وہی تلخ سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ ”بس یوں سمجھ لو کہ مجھے بھی کسی کی کھوج یہاں تک کھینچ لائی ہے۔“ ”تو کیا تمہاری کھوج ابھی مکمل نہیں ہوئی؟“ ”میری کھوج تو شاید کبھی مکمل نہ ہو۔۔۔۔۔ میں جس رستے کا مسافر ہوں، اس کی منزل آنے سے پہلے ہی زندگی کی شام ہو جاتی ہے۔ یہ درگاہ بھی صرف میرا ایک پڑاؤ ہی تو ہے، جانے کب یہاں سے بھی کوچ کرنے کا پروانہ مل جائے۔۔۔۔۔“

میں حیرت سے عبداللہ کا یہ فلسفہ سن رہا تھا۔ یہ میری اس نوجوان سے دوسری ملاقات تھی اور دونوں مرتبہ میں نے محسوس کیا تھا کہ عبداللہ وہ نہیں ہے، جو وہ بظاہر نظر آتا ہے۔ اتنے میں کاشف درگاہ کے عقیقی حصے سے نمودار ہوا اور اس نے وہیں سے مجھے باہر نکلنے کا اشارہ کیا۔ میں نے عبداللہ سے رخصت چاہی۔ ”یہ ہماری دوسری لیکن تشدد ملاقات تھی۔ امید ہے تیسری ملاقات جلد ہوگی اور ہم دونوں تب ٹھیک طرح سے ایک دوسرے کو جان پائیں گے۔“ عبداللہ نے مسکرا کر مجھ سے جوابی مصافحہ کیا۔ ”جب جب جو جو ہونا ہے۔۔۔۔۔ تب تب سوسو ہوتا ہے۔“ میں کاشف کی وجہ سے جلدی میں تھا لہذا عبداللہ کی اس گہری بات پر زیادہ غور نہ کر سکا۔ کاش میرا فہم اس وقت اس قدر وسیع ہوتا اور عبداللہ کی اس پیش گوئی کو سمجھ پاتا کہ آئندہ میری زندگی میں کیسے کیسے طوفان برپا ہونے والے ہیں۔

جب میں درگاہ سے باہر نکلا تب تک کاشف جیب میں سوار ہو چکا تھا۔ میرے پیٹھتے ہی اس نے ایک جھٹکے سے جیب آگے بڑھا دی۔ ”کام بن گیا ہے۔ میں نے پوری معلومات حاصل کر لی ہیں۔“ میں نے بے چین ہو کر کاشف سے وضاحت چاہی۔ ”رکومت۔۔۔۔۔ بولتے رہو۔“ کاشف نے گاڑی ہائی وے پر ڈال کر ریس بڑھا دی۔ ”دراصل پچھلی مرتبہ جب ہم یہاں ریس کے لیے آئے تھے، تب وہ جمعرات کا دن تھا۔ اسی لیے اس دن یہاں تمہیں بہت زیادہ بھیڑ بھی نظر آئی۔ وہ گاڑی بھی یہاں ہر جمعرات کو آتی ہے۔ گاڑی کے مالکان کے بارے میں تو میں کچھ زیادہ نہیں جان سکا، بس اتنا پتا چلا ہے کہ کوئی جدی پشتی ریس ہیں۔ جن دو عورتوں کو تم نے دیکھا تھا وہ ماں بیٹی ہیں۔ کبھی کبھار ان کے ساتھ لڑکی کا باپ بھی چڑھاوا چڑھانے آ جاتا ہے۔ البتہ ماں بیٹی کا گزشتہ دو برسوں سے یہ پکا معمول ہے کہ وہ ہر جمعرات کی شام یہاں آتی ہیں اور ہر پختہ ہزاروں روپے کا چڑھاوا چڑھا کر واپس چلی جاتی ہیں۔“ ”تمہیں یہ سب کچھ کس سے پتا چلا۔۔۔۔۔ میرا مطلب ہے کہ جمعرات کی شام آنے والے زائرین کی تعداد تو اچھی خاصی ہوتی ہوگی، پھر ان کے درمیان ایک خاص خاندان کو یاد رکھنے والا کون ہو سکتا ہے۔“ کاشف زور سے ہنسا۔ ”آپ کی اسی معصومیت پر قربان جانے کو جی چاہتا ہے جناب۔۔۔۔۔ یار چاہے ہر جمعرات سینکڑوں لوگ درگاہ کی زیارت کو آتے ہوں، پران میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ہوگا جو ہر بار ہزاروں روپے کی نذر دیتا ہو۔۔۔۔۔ اور پھر ان کی گاڑی اور ان کے رکھ رکھاؤ کو تو تم نے خود نوٹس کیا ہے۔۔۔۔۔ ایسے لوگ ہزاروں کی بھیڑ میں بھی ہوں، تب بھی انہیں پہچانا جاسکتا ہے۔ اب اپنا زیادہ سرمت کھپاؤ۔۔۔۔۔ صرف دو دن کی بات ہے۔۔۔۔۔ اس جمعرات کو ہم خود یہاں درگاہ کے دروازے کے قریب ڈیرہ لگائے بیٹھے ہوں گے۔ صرف ایک بار کار کار جسریشن نہر پتا چل جائے، پھر اس خاندان کا کھوج لگانا میرے ہائیں کا تھکا کھیل ہے، جسٹ ویٹ میری جان۔۔۔۔۔“

اگلے دو دن میری زندگی کے شاید سب سے زیادہ بے چین شب و روز تھے۔ ”پر وقت کسی طور گزر رہی جاتا ہے۔“ سو یہ دو دن بھی کٹ ہی

گئے اور جمعرات کی سہ پہر میں اور کاشف دونوں ہی اسی پہاڑی چٹان کی چوٹی پر بیٹھے اس کار کا انتظار کر رہے تھے، جہاں سے پہلی مرتبہ میری نظر اس گاڑی پر پڑی تھی۔ وقت بھی اس کچھوے کی طرح دھیرے دھیرے سرک رہا تھا، جو دور ساحل کے کنارے پانی میں اترنے کی کوشش میں سرگرداں تھا، لیکن ہر بار سمندر کی ایک بڑی لہر اسے اٹھا کر پھر سے دور ریتلے ساحل پر پٹخ دیتی تھی۔ میں نے بھی ہنسی مرتبہ اپنی کلائی پر بندھی گھڑی دیکھی، مجھے یہی لگا کہ میری گھڑی کی سوئیوں کو بھی وقت کی ایسی ہی کوئی منہ زور لہر اٹھا کر بار بار پیچھے ہٹ دیتی ہے۔ شاید وہ میرا تیر ہواں سگریٹ تھا، جب اچانک کاشف زور سے چلایا۔ ”وہ آگئی.....“ میں متوقع انتظار کے باوجود یوں زور سے چونک کر پلٹا، جیسے کوئی انہونی ہوگئی ہو۔ دور مل کھاتی سڑک پر وہی شیواریٹ ریت اثراتی دوڑتی چلی آ رہی تھی۔

# پاک سوسائٹی

## ڈاٹ کام



## زہرا

ہمارے درگاہ کی سیڑھیوں تک پہنچنے کے وقفے میں وہ دونوں ماں بیٹی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر جا پہنچی تھیں۔ کاشف نے جان بوجھ کر اپنی جیب شیور لیٹ کار کے بالکل قریب لاکر کھڑی کر دی تھی۔ کار کا وہ باوردی شوفاچ آج بھی اسی طرح کار کی صفائی میں مصروف تھا۔ اس کی جیب سے اترتے ہوئے جب مجھ پر نظر پڑی تو اس کی آنکھوں میں شناسائی کی ایک جھلک ابھرائی۔ جلدی سے سلام کر کے بولا ”ارے صاحب..... لگتا ہے آپ بھی ہماری بیگم صاحبہ کی طرح ہر جمعرات کو یہاں آتے ہیں۔“ ”نہیں..... ہماری تو یہ دوسری ہی جمعرات ہے..... دراصل میرے دوست کو اس درگاہ کی زیارت کا بہت ارمان تھا۔ سو اس ہفتے اسے یہاں لے کر آیا ہوں۔“ کاشف میرا اشارہ سمجھ گیا اور گاڑی کے گرد گھوم پھر کر ڈرائیور سے باتوں میں مشغول ہو گیا۔ ڈرائیور نے چونکہ آج ہمیں خود ایک بے حد قیمتی گاڑی سے اترتے دیکھا تھا اس لیے اس کے رویے میں مرعوبیت کی ایک واضح جھلک دکھائی دے رہی تھی۔ میں کاشف کو ڈرائیور سے معلومات لیتا چھوڑ کر سیڑھیاں چڑھتا ہوا درگاہ کے صحن میں جا پہنچا۔ آج میں جوتے اتارنا نہیں بھولا تھا۔ صحن میں پچھلی جمعرات کی طرح لوگوں کا ایک میلہ سالگ ہوا تھا اور بے حد بھیڑ تھی۔ مجھے عبداللہ کہیں دکھائی نہ دیا۔ میں نے اس ماہ رخ کی تلاش میں ادھر ادھر نظر دوڑائی تو وہ دونوں ماں بیٹی مجھے درگاہ کی مرکزی عمارت کے برآمدے میں بنی پتھر کی جالی کے قریب بیٹھی ہوئی دکھائی دیں اور پھر میرے ساتھ وہی ہوا جو پہلی مرتبہ اس لڑکی کو دیکھنے کے بعد ہوا تھا۔ یکا یک آس پاس کی ساری بھیڑ، سب لوگوں کا ہجوم اور ان کا سبھی شور یک دم موقوف سا ہو گیا۔ فضا جیسے ساکت سی ہو گئی اور مجھے یوں لگا کہ جیسے اس وسیع و عریض سنگ مرمر کے ڈھلے صحن میں صرف میں اور وہ ہی موجود ہیں۔ ہم دونوں کے درمیان صرف تنہائی ہے اور کائنات کا ہر ذرہ خاموش ہے، حتیٰ کہ آس پاس چلتی ہوئی پروانی بھی گونگی سی ہو کر صرف جسموں کو چھو کر گزر رہی ہے۔ اچانک کوئی سوالی مجھ سے زور سے ٹکرایا اور ایک جھٹکے سے میرے حواس واپس آ گئے۔ میں وہیں صحن میں کھڑا تھا۔ جانے دوپل گزرے تھے، یا دو صدیاں.....؟ مجھے کچھ یاد نہیں آ رہا تھا۔ لڑکی اب بھی اسی جذب کے عالم میں دوڑانوں بیٹھی جالی کی طرف منہ کئے، گزرتا رہے ہوئے کوئی دعا مانگ رہی تھی۔ میں سحر زدہ سا اسے دیکھتا رہا..... کالی چادر نے اس کا دمکتا نور اور بھی واضح کر دیا تھا اور اگر میں شاعر ہوتا تو شاید، اسی لمحے اس کے ہاتھوں کی گلابی خردلی انگلیوں اور لرزتی پلکوں پر پورا دیوان لکھ ڈالتا۔ رفتہ رفتہ لڑکی کا جسم ہچکیوں سے باقاعدہ لرزنے لگا اور وہ زار و قطار رونے لگی۔ اس کی ماں نے گہرا کر اسے تھا۔ آج ان کے ساتھ شاید ان کی کوئی خادمہ بھی آئی ہوئی تھی۔ لڑکی کی ماں نے سراپیمگی کے عالم میں اسے پانی کی بوتل دینے کا کہا۔ خادمہ ہڑبڑاتی ہوئی سی اٹھ کر باہر کی جانب بھاگی، شاید وہ گاڑی سے پانی لینے کے لیے گئی تھی۔ کبھی کبھی لمحے کے کسی ہزارویں حصے میں انسان کا دماغ اسے وہ کچھ کرنے پر مجبور کر دیتا ہے جو عام حالات میں وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتا۔ کچھ ایسا ہی اس وقت میرے ساتھ بھی ہوا۔ میرے قدم خود ہی یک بہ یک صحن میں درختوں کے نیچے پڑے پانی کے گھڑوں کی جانب بڑھ گئے اور میں کسی سحر زدہ روح کی طرح پانی کا گلاس لیے اس



لڑکی کی ماں کے پاس جا پہنچا۔ ماں نے جلدی سے بنا دیکھے گلاس پکڑ کر بیٹی کے منہ سے لگا دیا۔ پانی پی کر اس پری کی حالت کچھ سنبھلی لیکن اس کا رنگ اب بھی سرسوں کے کسی تازہ پھول کی مانند زرد ہو رہا تھا۔ ماں نے گلاس واپس کرتے ہوئے تشکر بھری نظروں سے مجھے دیکھا ”شکریہ بیٹا.....“

میں گلاس لیے چند قدم دور ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ ان چند لمحوں میں نہ جانے مجھے ایسا کیوں لگا کہ جیسے میرے سارے لفظ کہیں کھو گئے ہیں۔ مجھ سے کچھ بھی نہیں بولا گیا۔ اس ایک لمحے میں مجھے زبان اور لفظوں کی اہمیت اور قوت گویائی سے محروم بد نصیبوں کی بے بسی کا بہت شدت سے اندازہ ہوا۔ اتنے میں ان کی خادمہ بھی دوڑے ہوئے ہاتھ میں پانی کی بوتل لیے واپس پہنچ چکی تھی۔ ماں نے چند گھونٹ پانی بوتل سے بھی لڑکی کو پلائے، خادمہ کی مدد سے لڑکی کو کھڑا کیا اور واپسی کے لیے چل پڑیں۔ ماں نے جاتے جاتے ایک بار پھر میری جانب محبت بھری نگاہ ڈالی اور زیر لب شاید کوئی دعا بھی دی، لیکن میں یونہی بنا چلی گئی جھپکائے ساکت کھڑا رہا۔ جوش اس وقت آیا جب وہ تینوں درگاہ کا صحن پار کر کے بیرونی دروازے سے باہر نکل چکی تھیں۔ میں ایک دم حواس باختہ ہو کر یوں باہر کی جانب لپکا جیسے کوئی مجھ سے میری سب سے قیمتی چیز چھین کر لے بھاگا ہو۔ لیکن جب تک میں زائرین کی بھیڑ سے الگ تھا، راستہ بنانا ہوا یا ہر سیڑھیوں تک پہنچا وہ لوگ اپنی گاڑی میں بیٹھ کر جا چکے تھے۔ ڈرائیور نے کاشف سے ہاتھ ملایا اور میں نے دور ہی سے گاڑی کو روانہ ہوتے دیکھ کر بے بسی سے ہاتھ ملے۔ اس وقت مجھے خود پر شدید غصہ آ رہا تھا۔ قدرت نے آج خود مجھے اتنا بہترین موقع دیا تھا، میں کم از کم اس کی ماں کی دعا کا جواب تو دے سکتا تھا، ان لوگوں کی سیڑھیوں سے اترنے میں مدد تو کر سکتا تھا، لیکن میں تو بس کسی معذور انسان کی طرح کھڑا ہی رہ گیا۔ بوجھل دل کے ساتھ میڑھیوں سے نیچے اترتا تو کاشف میری جانب لپکا ”کیوں شہزادے..... کچھ بات بنی۔“ میں نے کاشف کو اپنی بے بسی کا احوال سنایا تو اس نے سر پیٹ لیا۔ ”کیا ہو گیا ہے یار.....؟ اتنا بہترین موقع ضائع کر دیا..... آخر تمہارے ساتھ مسئلہ کیا ہے.....؟“ میں نے ایک گہری سانس لی۔ ”اگر مسئلہ ہی سمجھ میں آ جاتا تو پھر رونا کس بات کا تھا.....؟“ کاشف نے اپنا سر جھٹکا۔ ”بہر حال میں نے ڈرائیور سے تمام ضروری معلومات حاصل کر لی ہیں۔ گاڑی کے مالک کا نام حاجی مقبول احمد ہے۔ ملک کے بہت بڑے صنعت کار ہیں۔ آباؤ اجداد یوپی سے ہجرت کر کے پاکستان آئے تھے۔ ادھیڑ عورت ان کی بیوی اور لڑکی ان کی بیٹی ہے۔ ایک معتدل اسلامی گھرانہ ہے اور حاجی صاحب خود بھی درگاہوں اور زیارتوں پر چڑھاوے چڑھانے جاتے رہتے ہیں۔ بھارت میں حاجی علی کی درگاہ کا سالانہ عرس وہ کبھی مس نہیں کرتے۔ ان کی بیٹی پڑھی لکھی ہے اور حال ہی میں اس نے یونیورسٹی سے اپنا ماسٹر ڈیگرم کیا ہے۔ وہ پہلے کبھی اپنے ماں باپ کے ساتھ ان زیارتوں اور درگاہوں پر نہیں جاتی تھی، لیکن بقول ڈرائیور پتا نہیں، اس کی بی بی جی کو گزشتہ دو سال سے کیا ہو گیا ہے کہ ہر جمعرات کو اس درگاہ کا پھیرا انہوں نے خود پر لازم کر لیا ہے اور ہاں..... لڑکی ماں باپ کی اکلوتی اولاد ہے.....“

میں نے سنا کئی نظروں سے کاشف کو داد دی۔ میں جانتا تھا کہ وہ ڈرائیور سے زیادہ تر باتیں اگلو الے گا، لیکن اس نے میری توقع سے کہیں زیادہ معلومات حاصل کر لی تھیں اور وہ بھی اتنے کم وقت میں۔ ”تمہاری اس اعلیٰ کوشش پر میں تمہیں انعام کا حق دار ٹھہراتا ہوں۔“ کاشف نے سعادت مندی سے سر جھکا لیا۔ ”آپ کی ذرہ نوازی ہے عالی جاہ..... لیکن غلام کی بات ابھی ختم نہیں ہوئی۔ اس مخبری کا آخری حصہ سن کر آپ یقیناً اپنی پوری سلطنت میرے حوالے کر دیں گے..... میں نے لڑکی کا نام بھی ڈرائیور کی زبان سے اگلو لیا ہے.....“ کاشف نے مجھے جھگ کرنے کے لیے

ایک لمبا وقفہ لیا۔ میں دم بخود کھڑا اس کی طرف یوں دیکھتا رہا جیسے وہ کچھ ہی دیر میں اس لڑکی کا نام نہیں، بلکہ مجھے میری زندگی، یا موت میں سے کسی ایک پروانے کی تحریر پڑھ کر سنانے والا ہو۔ شاید میری پوری زندگی میں، میری تمام سماعتوں نے مل کر بھی کبھی کسی ایک لفظ کو سننے کی اتنی شدید تمنا نہیں کی ہوگی، جتنی اس ایک لمحے میں مجھے کاشف کی زبان سے وہ نام سننے کی آرزو تھی..... ”زہرا..... زہرا نام ہے اس لڑکی کا.....“ میں نے دھیرے سے زیر لب دہرایا..... ”زہرا.....“ اس ماہِ کامل کا کچھ ایسا ہی نام ہونا چاہئے تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے میرے آس پاس دن ہی میں بہت سے چاند اکٹھے نکل آئے ہوں۔ کاشف غور سے میری بدلتی ہوئی حالت دیکھ رہا تھا۔ اس نے پلٹ کر جیب کا دروازہ کھولا۔ ”اگر میں گزشتہ پانچ برسوں میں ان بچا سوں لڑکیوں کے نام اور پتے نہ جانتا ہوتا، جو تمہاری زندگی میں ہفتے، دس دن یا مہینے کے لیے آ کر جا چکی ہیں، تو اس وقت تمہاری حالت دیکھ کر مجھے یہ یقین کرنے میں ایک لمحہ بھی نہیں لگتا کہ تم اس لڑکی کے شدید عشق میں مبتلا ہو چکے ہو۔ لیکن تمہارے گذشتہ ریکارڈ کی وجہ سے تمہیں فی الحال اس الزام سے بری قرار دیتا ہوں۔“ میں نے جواب میں خاموش رہنا ہی بہتر سمجھا۔ جب تک ہم ساحل سے واپس شہر پہنچے تب تک شام ڈھل چکی تھی اور شہر کی روشنیاں جگمگانے لگی تھیں۔

لیکن اس دن کے بعد میرے اندر کی تمام روشنی جیسے دھیرے دھیرے گھٹنے لگی۔ رات تک مجھے تیز بخار نے آگھیرا۔ ماما اور پاپا دونوں ہی کسی کانفرنس کے سلسلے میں جینوا گئے ہوئے تھے۔ ان کی واپسی اگلی شام تک متوقع تھی، لیکن میں ان کی آمد سے پہلے ہی مڈھال ہو چکا تھا۔ ماما تو میرے ماتھے پر ہاتھ رکھتے ہی بالکل بوکھلا سی گئیں۔ چند لمحوں ہی میں ہمارے فیملی ڈاکٹر، ڈاکٹر یزدانی اپنے تمام ”لوازمات“ سمیت میری خواب گاہ میں موجود تھے۔ میں نے پاپا سے احتجاج کیا ”دیکھیں نا پاپا..... یزدانی انکل پھر سے اپنی پوری لیبارٹری اٹھالائے ہیں۔“ ڈاکٹر یزدانی زور سے ہنسے۔ پاپا نے مسکرا کر کہا۔ ”کیا کریں یار..... ان کے تیس سالہ کیریئر میں صرف ہم نے انہیں اپنا فیملی ڈاکٹر ہونے کا شرف بخشا ہے۔ اب ان کے تجربے تو بھگتا ہی پڑیں گے۔ میری ساری ہمدردیاں تمہارے ساتھ ہیں بیٹا.....“ ”ممانے ہم دونوں کو غصے سے گھورا اور پاپا کو ٹوکا ”تو صیف آپ بھی نا..... بچے کے ساتھ بچہ بن جاتے ہیں۔ اسے شدید بخار ہے۔ یہ بات مذاق میں نالے والی نہیں ہے..... ڈاکٹر یزدانی آپ پر اپر چیک اپ کریں ساحر کا.....“ ماما کا موڈ دیکھ کر پاپا نے مجھے منہ پر انگلی رکھ کر چپ رہنے کا اشارہ کیا۔ مجھے ان کی یہی بات سب سے زیادہ پسند تھی۔ انتہائی غیر معمولی دباؤ میں بھی ان کا رویہ انتہائی نارمل رہتا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ ایک والد سے کہیں زیادہ میرے بہت اچھے دوست تھے۔ ڈاکٹر یزدانی نے بہت تفصیل سے میرے بخار کی تمام علامات نوٹ کیں اور چند ٹیسٹ کروانے کی تاکید کی۔ لیکن ان تمام ٹیسٹوں کا نتیجہ ان کے لیے مزید حیران کن تھا کیونکہ میرا ہر تجزیہ معمول کے مطابق تھا تو پھر یہ شدید بخار میرا پیچھا کیوں نہیں چھوڑ رہا تھا۔ ماما پاپا کے پیچھے پڑ گئیں کہ مجھے فوراً باہر کے کسی بڑے ہسپتال میں مزید ٹیسٹ کروانے کے لیے بھجوا دیا جائے۔ وہ تو خود بھی میرے ساتھ جانے کے لیے تیار بیٹھی تھیں۔ میں نے بڑی مشکل سے ڈاکٹر یزدانی کو اس بات کے لیے تیار کیا کہ وہ ماما کو سمجھائیں کہ اب ہمارے ملک ہی میں ہر بیماری کا علاج موجود ہے، اور پھر یہ تو صرف ایک معمولی بخار تھا۔ لیکن میں ماما کی طبیعت سے بھی اچھی طرح واقف تھا۔ اگر مزید کچھ دن میرا بخار نہ اترتا تو پھر انہیں روکنا کسی کے بس کی بات نہیں تھی۔

میرے بخار کو پانچواں روز تھا کہ اچانک ہی یعنی ساری چنڈال چوڑی کے ساتھ نازل ہو گئی۔ میرا گھر ”چڑیا گھر“ میں تبدیل ہو گیا۔



انہوں نے آتے ہی سب کچھ ٹپٹ کر دیا۔ میرا کمر اچکھ ہی دیر میں کسی میدان جنگ کا نقشہ پیش کرنے لگا تھا۔ ممانے میرے سارے دوستوں کو لنچ کر کے جانے کا کہا۔ کاشف نے ڈھٹائی سے جواب دیا کہ ”آئی لنچ کا وقت تو ہو ہی گیا ہے، آپ ڈنر کی تیاری بھی کر لیں کیونکہ اب ہم اس مریض کا مرض دور کئے بنا یہاں سے نہیں نلنے والے۔۔۔۔۔“ ممانستی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئیں۔ اسیلئے مسٹر کا پیڑ بیٹا جواد بولا ”لیکن تمہیں ہوا کیا ہے۔ ریس والے دن تو تم بھلے چنگے تھے۔۔۔۔۔؟“ کاشف نے معنی خیز نظروں سے میری جانب دیکھا۔ ”اسے روگ لگ گیا ہے۔۔۔۔۔ کوئی چہرہ بھا گیا ہے اسے۔“ عینی زور سے چوکی۔ میں نے آنکھ کے اشارے سے کاشف کو منع کرنے کی کوشش کی لیکن تب تک تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ عینی نے غور سے میری جانب دیکھا۔ ”کیا مطلب۔۔۔۔۔ میں کچھ سمجھی نہیں۔۔۔۔۔ اور ہاں۔۔۔۔۔ کاشف بتا رہا تھا کہ تم دونوں اس جمعرات کو بھی درگاہ گئے تھے۔۔۔۔۔ کہیں یہ روگ نہیں کا پالا ہوا تو نہیں ہے۔۔۔۔۔؟“ میں نے کھا جانے والی نظروں سے کاشف کو گھورا۔ کسی کے پول کا ذحول پینا تو کوئی اس سے سیکھے۔ کاشف نے گھبرا کر کندھے اچکائے لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ میں نے بات کا رخ موڑنے کی کوشش کی۔ ”تم بھی کس ایڈیٹ کی باتوں پر یقین کر بیٹھی ہو۔ ہم درگاہ گئے ضرور تھے لیکن ایک شان دار کار کے مالک کی کھوج میں۔۔۔۔۔“ لیکن عینی بھی بلا کی ذہین تھی۔ اسے مطمئن کرنا اتنا آسان نہیں تھا۔ اس کے چہرے پر ایک رنگ آ کر گزر گیا اور وہ دھیرے سے بولی۔ ”خدا کرے کہ کھوج صرف ایک شان دار کار تک ہی محدود رہے۔“ بات آئی گئی تو ہو گئی لیکن پھر سارا دن عینی کا موڈ آف رہا۔ وہ لوگ شام تک میرے گھر میں دھما چوکڑی مچاتے رہے۔ جاتے ہوئے ممانے ان سب سے وعدہ لیا کہ وہ لوگ اب آتے رہا کریں۔ ”عینی سب سے آخر میں گاڑی میں سوار ہوئی اور مجھے دیکھ کر ہاتھ ہلاتی ہوئی باقی سب کے ساتھ رخصت ہو گئی۔ ممانے میرے قریب ہی کھڑی تھیں۔ انہوں نے مسکراتے ہوئے معنی خیز نظروں سے میری جانب دیکھا۔ ”نئس گرل ساحر۔۔۔۔۔ ہے نا“ مجھے ان کے انداز پر ہنسی آ گئی۔ ”آپ جیسا سوچ رہی ہیں ایسا کچھ نہیں ہے۔۔۔۔۔“ ”اگر ویسا ہو بھی جائے تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہو گا مائی چائلڈ۔۔۔۔۔ بس تم خوش رہا کرو۔۔۔۔۔“

ممانے بھی مسکراتی ہوئی وہاں سے پلٹ گئیں۔ لیکن ہم انسانوں کا شاید سب سے بڑا مسئلہ ہی یہی تھا کہ ہم کبھی بھی خوشی کا کوئی مستقل فارمولا ہی تلاش نہیں کر پائے تھے۔ دو انسانوں میں سے کوئی ایک بات جو پہلے کے لیے خوشی کا سامان کر سکتی ہے، وہی بات دوسرے کے لیے انتہائی معمول کی خبر ثابت ہوتی ہے۔ شاید خوشی کا تعلق ہمارے اندر کی ضروریات سے ہوتا ہے۔ کوئی شرک پر گرا ایک روپے کا سکہ پا کر بھی خوشی سے نہال ہو جاتا ہے اور کسی کو بزنس میں کروڑوں کا فائدہ بھی مہینہ نہیں دے پاتا۔ ان دنوں میرے لیے بھی خوشی کے معنی یکسر بدل گئے تھے۔ گاڑیوں کی دوڑ اور ہیوی بانکس کی ریس، جو چند دن پہلے تک میرا جنون تھا، اب اس شغل میں بھی میرا دل نہیں اٹک رہا تھا۔۔۔۔۔ جیسے جیسے جمعرات کا دن قریب آتا جا رہا تھا، میرے اندر پھر سے ایک عجیب سی بے چینی پھیلتی جا رہی تھی اور پھر جمعرات کا دن بھی آ گیا۔ ممانے صبح پاپا کے ساتھ ہی نکل پکی تھیں لہذا مجھے روکنے والا گھر میں کوئی بھی نہ تھا۔ میں نے معمول کی طرح اپنی گاڑی نکالی اور سہ پہر ہونے سے بھی کافی قبل ساحلی درگاہ کے دروازے پر کھڑا تھا۔ آج اندر بہت زیادہ چہل پہل تھی۔ ایسے لگتا تھا جیسے کوئی خاص ہستی وہاں آئی ہوئی ہو۔ زہرا کی گاڑی عصر کے قریب وہاں آئی تھی اور ابھی تو ظہر کی اذانیں بھی ٹھیک طرح سے شروع نہیں ہوئی تھیں۔ میں نے عبداللہ کی تلاش میں یہاں وہاں نظر دوڑائی اور پھر وہ مجھے صحن کے وسط میں کسی شخص کے گرد جھوم میں ایک جانب کھڑا نظر آ گیا۔ اس نے مجھے دور سے دیکھتے ہی ہاتھ کے اشارے سے قریب بلایا۔ میرا جسم بخار سے پھٹک رہا تھا اور اس وقت مجھے کسی



سائے کی تلاش تھی لیکن صحن کے وسط میں تو سورج عین ہم سب کے سروں کے اوپر آگ برسا رہا تھا۔ لیکن میں عبداللہ کے بلاوے پر انکار نہ کر سکا اور اس کی جانب قدم بڑھا دیے۔

قریب جانے پر میں نے ایک بار پیش بزرگ کو لوگوں کے درمیان بیٹھے پایا۔ اس بوڑھے شخص کے چہرے پر ایک عجیب سا جلال تھا، جو انسان کو اس کی جانب دوسری نظر ڈالنے سے روکتا تھا۔ آس پاس سبھی لوگ نہایت مؤدب بیٹھے ہوئے تھے۔ بزرگ کے ہاتھ میں تسبیح تھی، جسے وہ آنکھیں بند کئے پڑھے جارہے تھا۔ مجھے اس سناٹے سے کچھ عجیب سی وحشت محسوس ہونے لگی تھی۔ چند لمحوں کی گزر گئی۔ میں نے ابھٹن آمیز انداز میں عبداللہ کی جانب دیکھا۔ عبداللہ نے آنکھیں میچ کر مجھے خاموشی سے بیٹھے رہنے کا اشارہ کیا۔ اچانک اس بزرگ نے اپنی آنکھیں کھولیں اور براہ راست میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے زور سے گرج کر بولا ”آگیا تو..... اتنی دیر کہاں لگا دی.....؟“



**We at Paksociety.com giving you the facility to download urdu novels,Imran series,Monthly digests with direct links and resumeable direct link along with the facility to read online on different fast servers**

**If site is not opening .or you find any issue in using site send your complaint at admin@paksociety.com**

**or  
send message at  
0336-5557121**

## سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا

میں نے گھبرا کر اپنے پیچھے دیکھا، لیکن وہ بزرگ مجھ سے ہی مخاطب تھے۔ میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے عبداللہ کی جانب دیکھا۔ عبداللہ نے دھیرے سے بزرگ کے کان میں کچھ کہا۔ اس نے زور سے اپنے لمبے بال جھٹکے اور مجھ پر ایک نگاہ غلط ڈالی۔ ”جانتا ہوں میں..... اس ساحر کو بھی اور اس کے سحر کو بھی۔ اس سے پوچھو کہ یہ یہاں کس پر اپنا سحر پھونکنے آیا ہے..... یہاں اس کی دال نہیں گٹگی.....“ پھر یکایک نہ جانے اس بوڑھے کو کیا ہوا۔ ”سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا..... جب لا دچلے گا، بخار.....“ پھر وہ بزرگ ایک دم ہی یوں مراقبے میں چلا گیا جیسے اسے ہم سب سے کوئی غرض ہی نہ رہی ہو۔ عبداللہ نے اشارے سے بھیڑ کو چھٹ جانے کا اشارہ کیا۔ سب لوگ خاموشی سے وہاں سے اٹھ کر دو رہٹ گئے۔ عبداللہ بھی میرا ہاتھ تھامے ہوئے درختوں کے سائے کی طرف چلا آیا، جہاں زمین پر ایک چٹائی بچھی ہوئی تھی۔ دفعتاً عبداللہ کو احساس ہوا کہ میرا ہاتھ تپ رہا ہے۔ اس نے جلدی سے گھڑے سے پانی کا ایک گلاس نکال کر مجھے پیش کیا۔ پانی پیتے ہی مجھے یوں لگا جیسے میری روح تک میں اس کی تاثیر اترتی چلی گئی ہو۔ میرا دل چاہا کہ میں عبداللہ سے پانی کا ایک اور گلاس مانگ لوں، لیکن جانے کیوں میں ایسا نہ کر سکا۔ عبداللہ نے تشویش سے میری جانب دیکھا۔ ”یہ حالت کب سے ہے تمہاری.....؟“ بچھلی جمعرات سے..... جب میں درگاہ سے واپس گھر پہنچا تھا، تب سے اسی طرح اس بخار میں پھنک رہا ہوں.....“ میری بات سن کر عبداللہ نہ جانے کس سوچ میں پڑ گیا۔ میں نے اسے ٹوکا ”اچھا میری بات چھوڑو..... یہ بتاؤ یہ بڑے میاں کون ہیں..... اور اتنے جلال میں کیوں ہیں.....؟“ عبداللہ میری بات سن کر چونکا اور جب اسے میرا اشارہ سمجھ میں آیا تو ایک گہری مسکراہٹ اس کے چہرے سے چھٹک پڑی۔ ”اوہ..... وہ..... بھئی وہ بڑے میاں تو ہمارے بھی بڑے ہیں..... ہم انہیں حاکم بابا کے نام سے پکارتے ہیں۔“ ”کیا مطلب..... کیا یہی صاحب تمہارے باس ہیں؟“ ”باس کا لفظ سن کر عبداللہ نے بڑی مشکل سے اپنی ہنسی روکی۔ ”ہاں میاں..... باس بھی کہہ سکتے ہو..... مجھے اور مجھ جیسے اور بہت سوں کو حاکم بابا کے ذریعے ہی احکامات ملتے ہیں۔ کس نے کہاں جانا ہے، کہاں رکنا ہے؟ کس علاقے میں کس کارندے کی ضرورت ہے، کس طرح کے لوگوں میں تعلیم کس طرح بانٹنی ہے..... یہ سارے معاملات حاکم بابا ہی طے کرتے ہیں۔“ میں حیرت سے عبداللہ کی بات سنتا رہا۔ ”کارندے.....؟ کیا مطلب.....؟ کیا تمہاری طرح اور بھی خدمت گار ہیں اس درگاہ کے اندر.....؟ مطلب تم لوگوں کا پورا ایک نیٹ ورک ہے۔“ لیکن تم نے ابھی تعلیم کی بات کی تھی..... تم لوگ کیسی تعلیم دیتے ہو لوگوں کو..... اور کیا حاکم بابا کے اوپر بھی کوئی اور عہدے دار موجود ہے.....؟“ ”تعلیم سے مراد کوئی اسکول کی پڑھائی نہیں ہے..... بس لوگوں کی خدمت کرنا ہوتی ہے..... جیسے میں اس درگاہ میں آنے والے زائرین کی مدد کرتا ہوں..... انہیں کسی چیز کی ضرورت ہو، یا کسی قسم کی معلومات درکار ہوں تو وہ میں انہیں فراہم کرتا ہوں..... جب کہ حاکم بابا سے اوپر کے تمام انتظامات سلطان بابا سنبھالتے ہیں۔ البتہ ہمارا ان سے رابطہ کبھی کبھار ہی ہوتا ہے۔ دراصل سلطان بابا، حاکم بابا اور ان جیسے دوسروں کے بھی باس ہیں..... ہم تو



ان کے ماتحتوں کے بھی ماتحت ہیں.....“

میری حیرت لمحہ بہ لمحہ بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ مطلب یہ کہ حاکم بابا جیسے بھی دیگر کئی حکام موجود تھے۔ پھر تو سلطان بابا واقعی کوئی بستی ہوں گے، کیونکہ میری تو آدمی جان حاکم بابا کا جلال دیکھ کر ہی نکل گئی تھی۔ جانے سلطان بابا کے رعب اور جلال کا کیا عالم ہوگا؟ گویا ان لوگوں کی پوری ایک انتظامیہ تھی، جیسے اسسٹنٹ کمشنر کے اوپر ڈپٹی کمشنر اور ڈپٹی کمشنر کے اوپر کمشنر تعینات ہوتا ہے۔ اسی طرح عبداللہ کے اوپر کی چین آف کمانڈ بھی پوری طرح متحرک تھی۔ لیکن اس نفسا نفسی کے دور میں جب بھائی اپنے بھائی کا گلا کاٹنے پر تلا ہوا ہے، ایسے بے غرض اور بے لوث لوگ بھی موجود ہیں جو صرف دوسروں کی تکلیف اور درد کو دور کرنے کے لیے اپنا چین اور آرام تیاگ دیتے ہوں گے.....؟؟ مجھے اس بات پر اب بھی پوری طرح یقین نہیں آیا تھا..... اور پھر ان لوگوں کے اپنے اخراجات بھی تو ہوتے ہوں گے۔ یہ سارا خرچہ کون اٹھاتا ہوگا؟ کیا سلطان بابا سے اوپر بھی کوئی عہدے دار موجود ہوگا؟ جیسے کمشنر کے اوپر صوبے کا چیف سیکرٹری ہوتا ہے۔ میرے ذہن میں ایسے نہ جانے کتنے سوالات کلبار رہے تھے۔ لیکن ایک دم ہی گھبرا سا یہ ساچھا گیا۔ یوں لگا جیسے گرم جتنی دو پہر میں ٹھنڈے پانی سے بھری کوئی بدلی سورج کے عین سامنے آ کر رک گئی ہو۔ وہ ماہ جہیں اپنے کوئل قدم درگاہ کے صحن میں دھر چکی تھی اور حسب معمول اس کی ماں اور خادمہ بھی ساتھ ہی آئے تھے۔ جانے موسم کی تمام شدت اور دھوپ کی ساری حدت ایک ہی پل میں کہاں غائب ہو گئی۔ مجھے یوں لگا کہ دور سمندر کی طرف سے چلنے والی پروائی نے ساری درگاہ کے گرد اپنا گھبراہندہ دیا ہو۔ کسی ایک شخصیت کی موجودگی ہمارے ارد گرد کے موسم پر اس قدر شدت اور تیزی سے کیسے اثر انداز ہو سکتی ہے؟..... مجھے آج تک اس سوال کا جواب نہیں مل سکا۔ کیا باہر کے سبھی موسم جھوٹے ہوتے ہیں اور ان کا تعلق صرف ہمارے اندر کے موسم ہی سے ہوتا ہے۔ وہ پری رخ اب دھیرے دھیرے چلتی ہوئی، جیسے پانیوں پر قدم رکھتی ہوئی حاکم بابا کے بالکل سامنے جا بیٹھی تھی۔ حاکم بابا نے اس کے سلام کے جواب میں وعادی اور اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ مطلب یہ کہ وہ پہلے بھی حاکم بابا سے مل چکی تھی۔ حاکم بابا نے زہرا کی ماں سے کچھ پوچھا اور قریب کھڑے خادم کے ہاتھ سے پانی کا گلاس لے کر اس پر کچھ پڑھا اور پھونک کر زہرا کو پینے کے لیے دے دیا۔ میں اس ماہوش کو دیکھنے میں اس قدر محو تھا کہ مجھے عبداللہ کے اٹھ کر چلے جانے کا احساس تک نہ ہوا۔ لیکن میں نے آج یہ تجویز کیا ہوا تھا کہ کسی نہ کسی بہانے زہرا سے ہم کلام ہونے کی کوشش ضرور کروں گا۔ اس سے یہ پوچھنے کی جسارت ضرور کروں گا کہ آخر وہ کون سی منت ہے جو اسے یہاں اس ویرانے میں اتنی دور تک کھینچ لائی ہے؟ وہ تو خود کسی منت کی طرح ہے، جس کی قبولیت کے لیے ایک عالم تا عمر مجھ سے میں پڑا رہ جائے..... روپ کی ایسی دولت، دنیا میں کچھ کم ہی خوش نصیبوں کو حاصل ہوتی ہے۔ وہ تو خود ایک دعا تھی..... پھر وہ اپنا وقت دعاؤں میں کیوں ضائع کر رہی تھی۔

میں جانے کتنی دیر اس کی طرف دیکھتے ہوئے گم صم سا بیٹھا رہا۔ ہوش اس وقت آیا جب وہ تینوں وابسی کے لیے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ میں جلدی سے پانی کا بھرا گلاس لے کر درگاہ کے داخلی دروازے کے قریب بیٹھ کر ذرا ہٹ کر کھڑا ہو گیا اور جب وہ تینوں میرے قریب سے گزرنے لگیں تو میں نے جلدی سے پانی کا گلاس زہرا کے سامنے کر دیا۔ وہ ٹھٹھک کر رک گئی۔ اس کے پیچھے آتی اس کی ماں اور خادمہ کبھی رکنا پڑا۔ میرے ہاتھ میں پانی کا گلاس تھا لیکن خود میرے حلق میں شدید پیاس کے مارے کانٹوں کا ایک جنگل سا آگ آیا تھا۔ زہرا نے سوالیہ نظروں سے میری جانب

دیکھا۔ مجھ سے کچھ نہیں بولا گیا۔ پھر شاید اس کی ماں نے مجھے پہچان لیا کہ میں وہی ہوں جس نے کچھلی مرتبہ بھی زہرا کے لیے پانی پیش کیا تھا۔ وہ ہلکے سے مسکرا دیں اور زہرا کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر بولیں۔ ”لے لو بیٹا..... پانی کا انکار نہیں کرتے.....“

زہرا نے چپ چاپ میرے ہاتھوں سے گلاس لے کر اپنے نازک لبوں سے لگا لیا اور چند گھونٹ پی کر واپس میری جانب بڑھا دیا۔ میں اس محویت سے دیکھ رہا تھا کہ مجھے احساس ہی نہیں ہوا کہ وہ ہاتھ میں گلاس لیے کھڑی ہے۔ مجبوراً اسے ہلکا سا کھارنا پڑا اور میں چونک سا گیا۔ میں نے جلدی سے شرمندگی کے عالم میں گلاس واپس لے لیا اور نام لہجے میں کہا، ”معاف کیجئے گا..... میرا دھیان کسی اور جانب تھا۔“ اس نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور چادر درست کرتے ہوئے آگے بڑھ گئی۔ زہرا کی ماں نے گزرتے وقت میرے سر پر ہاتھ رکھا اور دعا دی۔ ”جیتے رہو بیٹا..... کسی اچھے گھرانے کے لگتے ہو..... خدا تمہاری آرزو پورے کرے۔“ پتا نہیں اچانک ہی میرے منہ سے کیسے نکل گیا۔ ”کیا یہاں آکر مانگنے سے خدا ہر آرزو پوری کر دیتا ہے.....؟“ خاتون نے لمبی سی سانس لی اور دھیرے سے کہا۔ ”ہاں بیٹا..... جس کا نصیب ہو اسے ملتے زیادہ دیر نہیں لگتی..... پر ہماری آزمائش شاید کچھ طویل ہے..... سدا خوش رہو.....“ وہ مجھے دعا دے کر آگے بڑھ گئیں۔ میں نے مناسب فاصلہ رکھ کر، پیچھے دیکھا تو زہرا پہلے ہی سیزرھیاں اتر کر گاڑی میں بیٹھ چکی تھی اور اب اس کی ماں اور خادمہ دھیرے دھیرے سیزرھیاں اتر کر جا رہی تھیں۔ آج پہلی بار میں نے زہرا اور اس کی ماں کے لباس پر غور کیا۔ وہ دونوں ہی یونی کے مخصوص اور روایتی لباس میں ملبوس تھیں۔ زہرا نے جدید وضع کا کرتا پاجامہ، جب کہ ماں نے بھاری کام دار سفید شرارہ پہنا ہوا تھا۔ ان کے لہجے میں کھنک اور الفاظ کا چناؤ بھی خالص اردو تہذیب یافتہ گھرانوں والا تھا۔ لیکن اس گل رخ کے مرمریں لب تو میرے کوشش کے باوجود بھی کھل نہ سکے۔ کاش وہ ایک ”شکریے“ کا لفظ ہی کہہ جاتی۔ آخر ایسا بھی کیا غرور کیا گھمنڈ تھا اسے..... لیکن پھر بعد میں، میں نے خود ہی اپنے خیال کی نفی کر دی۔ ”نہیں..... شکریہ جیسے تکلفات میں تو وہ لوگ پڑتے ہیں، جن کا تعلق اس دنیا سے ہوتا ہے اور اس ماہ رو کی تو حالت صاف چغلی کھار ہی تھی کہ وہ کسی اور پرستان کی شہزادی ہے۔ اسے اپنا ہوش ہی کہاں تھا کہ وہ ایسے ظاہری آداب کا خیال رکھ پاتی۔ زہرا کی گاڑی اشارت ہونے کی آواز کے ساتھ ہی میرے دل میں ایک عجیب سی خواہش ابھری اور میں ہاتھ میں پکڑا گلاس ساتھ کھڑے زائر کے ہاتھ میں پکڑا کر نیچے کی جانب لپکا۔ پھر ایک ساتھ تین تین سیزرھیاں پھلانگتا ہوا گاڑی تک پہنچا اور گاڑی کو دور ریٹ ازاتی، شہر کی طرف جاتی، زہرا کی گاڑی کے پیچھے ڈال دیا۔

جانے یہ زہرا کا گھر دیکھنے کی خواہش تھی، یا پھر ایک مرتبہ اس کا روپ اپنی آنکھوں میں بھر لینے کی..... لیکن میں لگا تار ان کی گاڑی کا پیچھا کرتا رہا، حتیٰ کہ شہر کا وہ بیش قیمت مضافاتی حصہ شروع ہو گیا جہاں پرانی وضع، لیکن انتہائی متمول طبقے کی حویلیاں موجود تھیں۔ یہ تمام حویلیاں کئی ایکڑ پر پھیلی ہوئی تھیں اور زنانے، مردانے اور پائیم باغ کا جو تصور اب ہمارے بڑے گھروں میں تقریباً مفقود ہی ہو چکا تھا، وہاں اب بھی پوری آب و تاب کے ساتھ موجود تھا۔ زہرا کی گاڑی بھی ایک ایسی ہی عظیم الشان حویلی کے پھانک سے اندر داخل ہو گئی۔ میں نے اپنی گاڑی پھانک کے قریب لا کر روک دی۔ اندر ایک طویل سی رنگین پتھروں کی روش سے ہوتی ہوئی زہرا کی گاڑی پورچ تک پہنچ چکی تھی۔ ڈرائیور نے جلدی سے پیچھے کے دونوں دروازے کھولے اور زہرا اسی شان سے گاڑی سے اتری جو اس کی شخصیت کا خاصہ تھی۔ میں کافی دیر اسی سحر میں حویلی کے باہر اپنی گاڑی میں



بیٹھا رہا اور پھر شام ڈھلے وہاں سے لوٹ آیا۔

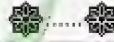
گھر میں ماما اور پاپا پریشانی کے عالم میں لان ہی میں ٹپکتے ہوئے دکھائی دیے۔ میری گاڑی کی آواز سنتے ہی ماما تیزی سے میری جانب نکلیں۔ ”ساحر..... کہاں چلے گئے تھے تم..... کتنا پریشان تھے میں اور تمہارے پاپا..... کیوں ستاتے ہو ہمیں اتنا.....؟“ ماما روہائی سی ہو گئیں، لیکن میں انہیں منانا خوب جانتا تھا۔ ایک عجیب بات اس دوران یہ ہوئی تھی کہ میرا بخار نہ جانے دن کے کسی پہر میں بالکل ہی غائب ہو گیا تھا۔ میں نے ماما کا ہاتھ اپنے ماتھے پر رکھ کر انہیں یقین دلایا کہ اب میں بالکل ٹھیک ہوں۔ خدا خدا کر کے ماما کی ناراضی ختم ہوئی اور ہم تینوں نے بہت عرصے بعد اکٹھے بیٹھ کر ڈنر کیا۔ ماما کی تسلی تو ہو گئی تھی لیکن پاپا کی نگاہوں میں اب بھی بہت سے سوال چل رہے تھے۔ آخر ڈنر کے بعد جب ہم سب لان میں بیٹھے تھے تو پاپا نے ماما سے خاص ان کے ہاتھ کی بنی ہوئی کافی کی فرمائش کی اور وہ اٹھ کر کافی بنانے چلی گئیں تو پاپا کا موقع مل گیا۔ انہوں نے ماما کے اندر جاتے ہی جلدی سے کہا۔ ”ہاں بھائی جوان..... کوئی سگریٹ وغیرہ ہے تو نکالو..... ابھی تمہاری ماما واپس آ جائیں گی تو ان کے سامنے دھواں اگلتا مشکل ہو جائے گا.....“ میرا اور پاپا کا ایک ہی برائے تھا۔ میں نے انہیں جیب سے سگریٹ نکال کر پیش کی۔ ایسے موقعوں پر ہم باپ بیٹا نہیں، بلکہ صرف بہت اچھے دوستوں کی طرح برتاؤ کرتے تھے۔ لیکن آج میرا سگریٹ پینے کو بھی نہیں چاہ رہا تھا۔ پاپا نے سگریٹ ساگ کر ہونٹوں سے لگا لی اور میری جانب غور سے دیکھا۔ ”تم نہیں پیو گے آج.....؟“ ”نہیں..... پاپا جی نہیں چاہ رہا.....“ ”میں کچھ دنوں سے دیکھ رہا ہوں کہ تم ہر چیز سے کچھ اکتائے اکتائے سے رہنے لگے ہو..... کوئی خاص وجہ.....؟ اور پھر یہ بخار.....؟..... مجھ سے شیمز نہیں کرو گے.....؟“ میں نے ایک لمبی سی سانس لی اور ماما کے آنے سے پہلے مختصر آدھرا اور اس درگاہ کے بارے میں ہر بات بتا دی۔ ماما کافی لے کر آئیں تو ہماری گفتگو میں کچھ دیر کا وقفہ آیا۔ کافی پینے کے بعد ماما کی یواہیں اے سے ایک ضروری فون کال آگئی اور مجھے اور پاپا کو پھر سے کھل کر بات کرنے کا موقع مل گیا۔ ”کہیں تمہیں اس لڑکی سے محبت تو نہیں ہو گئی.....“

”محبت..... نووے پاپا..... اس نے آج تک کبھی مجھے نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ ہمارے درمیان کبھی گفتگو تو کیا ایک آدھ نظر بتا دے بھی نہیں ہوا..... پھر مجھے اس سے محبت کیسے ہو سکتی ہے؟“ ”محبت کا تعلق لفظوں اور گفتگو سے بھلا کب ہوتا ہے؟ میں تو اسے نظر سے نظر کا رشتہ سمجھتا ہوں..... ہاں البتہ تمہارے کیس میں نظر کے اس ٹکراؤ کی بھی کمی ہے..... بہر حال ایک بات یاد رکھنا..... محبت میں جتنا ہونے کے لیے کسی خاص اور لگے بندھے اصول کی کبھی ضرورت نہیں ہوتی..... یہ کسی بھی لمحے بہتی ہوئی طرح آپ کے خون کے خلیوں میں شامل ہو کر نرسوں میں بہنا شروع کر سکتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس لمحے تم اس جذبے کو پوری طرح سمجھنے سے قاصر رہے ہو، لیکن جب کبھی تمہیں محسوس ہوا کہ یہ محبت ہی ہے تو ہمیں اطلاع کر دینا، ہم اگلے ہی دن تمہارا رشتہ لے کر اس لڑکی کے در پر سوالی بنے کھڑے ہوں گے..... جسٹ ٹیک پور ٹائم۔“ پاپا میرا گال تھپتھا کر وہاں سے اٹھ گئے۔ لیکن مجھے ایک نئے عذاب میں ڈال گئے۔ وقت ہی تو نہیں تھا میرے پاس۔ نہ جانے کیوں ہر گزرتے لمحے کے ساتھ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وقت میرے ہاتھ سے ریت کی طرح پھسل رہا ہو، جیسے کوئی انہونی ہونے والی ہو۔

مجھ سے یونیورسٹی اور سب دوست تقریباً چھوٹ ہی چکے تھے۔ یہ انہی کی ہمت تھی کہ کسی نہ کسی طرح مجھے کہیں سے ڈھونڈ لیتے تھے۔ ورنہ میرے صبح و شام کہاں بسر ہو رہے تھے، اس کی خبر خود مجھے بھی نہیں تھی۔ جب کبھی ہوش آتا تو خود کو ذرا کے گھر کے باہر، یا پھر درگاہ کے صحن میں بیٹھا ہوا

پاتا تھا۔ ایک ایسی ہی گرم دوپہر، جب میں درگاہ کے صحن میں پہلا قدم ہی رکھ پایا تھا کہ حاکم بابا کی کڑکتی ہوئی آواز نے میرے قدم وہیں جما دیے۔ ”جا..... نکل جا یہاں سے..... اپنے نفس کے پیچھے بھاگنے والوں کے لیے اس آستانے پر کوئی جگہ نہیں ہے۔“ میں نے گھبرا کر نظریں اٹھائیں تو حاکم بابا کو عین اپنے سامنے کھڑے پایا۔ وہ پھر زور سے چلائے ”آ خر کب تک لڑے گا..... میں کہتا ہوں ہتھیار ڈال دے.....“ اتنے میں ان کے پیچھے سے ایک ملازم سی آواز ابھری۔ ”حاکم..... بچے کو تنگ نہ کر..... اسے اندر آنے دے..... حاکم بابا سامنے سے بٹے تو ان کے پیچھے ایک عجیب نورانی چہرے والے سرخ سپید رنگت والے بزرگ کھڑے نظر آئے۔ ”آؤ بچے..... اندر آ جاؤ..... میرا نام سلطان ہے..... یہ سب مجھے سلطان بابا کے نام سے پکارتے ہیں۔“

جانے سلطان بابا کی آنکھوں میں ایسی کیا بات تھی۔ ان سے نظر ملتے ہی مجھے زور کا چکرا آیا اور دوسرے ہی لمحے میں ہوش کی وادیوں سے دور چکرا کر زمین پر گر چکا تھا۔ آخری آواز جو میرے کانوں میں ابھری وہ کسی زائر کی تھی۔ ”ارے کوئی اسے پکڑو..... لڑکا بے ہوش ہو گیا۔“



**We at Paksociety.com giving you the facility to download urdu novels,Imran series,Monthly digests with direct links and resumeable direct link along with the facility to read online on different fast servers**

**If site is not opening or you find any issue in using site send your complaint at admin@paksociety.com**

**or**

**send message at  
0336-5557121**



## محبت سی ہو گئی ہے

جب مجھے ہوش آیا تو میں شہر کے پہلے ترین ہسپتال کے بستر پر تھا۔ پاپا، ماما اور میرے سب ہی دوست پریشان سے میرے سر ہانے کھڑے تھے۔ کاشف نے بتایا کہ انہیں ہسپتال ہی سے کسی نے فون کر کے یہاں بلایا تھا اور ان کے مطابق مجھے درگاہ سے عبداللہ نامی کوئی لڑکا میری ہی گاڑی میں ڈال کر کسی ڈرائیور کے ہمراہ یہاں تک چھوڑ گیا تھا۔ اس نے ماما، پاپا کے آنے تک وہیں انتظار کیا اور پھر گاڑی کی چابی ان کے حوالے کر کے چل دیا۔ تب تک ڈاکٹر ز میرے تمام ٹیسٹ وغیرہ کروا چکے تھے اور انہوں نے عبداللہ کی موجودگی ہی میں بتایا تھا کہ ”میں بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں، ہو سکتا ہے دھوپ کی زیادتی کی وجہ سے چکر آ گیا ہو۔“ پاپا نے ہی میرے دوستوں کو اطلاع کروائی تھی۔ وہ سب ہی مجھ سے کوئی نہ کوئی بات کر رہے تھے، سوائے عینی کے..... وہ بالکل ہی خاموش اور چپ چاپ سی ایک جانب کھڑی تھی۔ کچھ ہی دیر میں نرس نے انہیں میرے آرام کی خاطر جانے کو کہا تو وہ سب ایک ایک کر کے مجھ سے رخصت ہو گئے۔ سب سے آخر میں عینی میرے بستر کے قریب آئی اور ہاتھ ملاتے ہوئے دھیرے سے بولی ”میں خدا سے دعا کروں گی کہ وہ تمہاری درگاہ کی منت پوری کر دے۔“ میں نے چونک کر اس کی جانب دیکھا۔ اس کی بھرائی ہوئی آنکھیں چھلکنے کو تیار ہی تھیں۔ اس نے اپنی بات جاری رکھی۔ ”مجھے کاشف نے سب کچھ بتا دیا ہے سار..... مجھے اپنی ہار سے زیادہ اس لڑکی کی جیت پر خوشی ہے۔ چلو کوئی تو ہے اس دنیا میں ایسا جو پہلی ہی نظر میں تمہارے دل میں اترنے کا ہنر جانتا ہے..... میری مانو تو اب ویر نہ کرنا..... کبھی کبھی محبت میں اک ذرا سی دیر بھی صدیوں کی مسافت بڑھانے کا سبب بن جاتی ہے..... چلتی ہوں..... اپنا بہت خیال رکھنا۔“ عینی پلٹ کر چل دی۔ میں اسے پیچھے سے آوازیں ہی دیتا رہ گیا۔ ماما جو اس وسیع و عریض کمرے کی دوسری جانب ڈاکٹر سے میرے متعلق کسی بحث میں مشغول تھیں، انہوں نے غور سے عینی کو یوں پلٹ کر جاتے اور مجھے اسے روکنے کے لیے آوازیں دیتے ہوئے دیکھا اتنے میں کاشف نے اندر جھانکا تو میں نے غصے سے اسے قریب آنے کا اشارہ کیا۔ اس نے قریب آتے ہی اپنے کان پکڑ لیے اور اس سے پہلے کہ میں اسے کچھ کہتا، وہ خود تیزی سے فر فر اپنی صفائی پیش کرنے لگا۔ ”میں جانتا ہوں، تمہیں بہت برا لگا ہوگا، لیکن یقین کرو یا میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ تمہاری حالت کی وجہ سے اسے پہلے دن ہی سے تم پر شک ہو گیا تھا اور پھر جس طرح سے تم یک دم غائب ہو گئے میرے پاس اس کے سوالوں کا کوئی جواب نہیں رہ گیا تھا۔“ لیکن تم نے اس سے یہ کیوں کہا کہ مجھے زہرا سے محبت ہو گئی ہے.....“

ممانے دور سے کاشف کو آواز دی تو وہ وہاں سے ٹل گیا۔ میں کسی گہری سوچ میں ڈوبنے لگا۔ کاشف ٹھیک ہی تو کہہ رہا تھا، یہ ساری علامات اسی ایک جان لیوا بیماری کی طرف ہی تو اشارہ کرتی تھیں، جسے عرف عام میں ”محبت“ کہا جاتا ہے اور بقول کاشف اگر محبت نہیں تو کم از کم ”محبت سی“ ضرور ہو گئی تھی۔

اور جب رات کو ہسپتال سے ڈسچارج ہونے کے بعد میں گھر پہنچا تو یہی بحث مہم اور پاپا میں چھڑ چکی تھی۔ پاپا میرے بے ہوش ہونے کا دباؤ برداشت نہیں کر سکے تھے اور انہوں نے گھبرا کر ماما کو سب کچھ بتا دیا تھا اور اب ماما بضد تھیں کہ اگر یہ ساری کیفیات، اس ایک لڑکی ہی کی وجہ سے تھیں تو پھر مزید انتظار کرنا سراسر حماقت ہے۔ میں نے کچھ کہنے کی کوشش کی تو دونوں نے جھڑک کر خاموش کر دیا اور طے یہ پایا کہ کل ہی ماما اور پاپا جا کر حاجی مقبول سے میرے لیے زہرا کا ہاتھ مانگ لیں گے۔ شاید میرے والدین دنیا کے سب سے الگ، سب سے منفرد اور سب سے زیادہ پیار کرنے والے والدین تھے۔ حاجی مقبول صاحب کا تو معاشرے میں بڑا نام تھا۔ جانے ملک کے کتنے فلاحي ادارے ان کے تعاون سے چل رہے تھے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ زہرا اگر کسی جھوٹپیڑی میں بھی رہ رہی ہوتی تو تب بھی ماما اور پاپا اسے جھٹ اسی طرح اپنی بہو بنانے پر تیار ہو جاتے، صرف میری خوشی کے لئے۔ اس لمحے مجھے اپنے لڑتے بھگڑتے والدین پر بے حد پیار آیا۔ انہوں نے ساری زندگی مجھے ہاتھ کا چھلا بنا کر پالا تھا اور پھر میرے دل اور دماغ کی جنگ کو بھی ایک سرقرس آ گیا۔ ”زہرا میری ہو جائے گی۔“ یہ سوچ کر ہی میرے روئیں روئیں میں سکون اور اطمینان کی ایک عجیب سی لہر دوڑنے لگی تھی۔ تو گویا یہ محبت ہی تھی اور مجھے اس دیوی کے چرنوں میں اپنے سارے ہتھیار ڈالنا ہی پڑے تھے، خواہ خواہ میں نے اتنے دن تک خود کو اس دردناک عذاب سے دوچار رکھا۔ میں ساری رات زہرا کے خیالوں میں کھویا رہا۔ پتا ہی نہیں چلا کہ کب صبح ہوئی اور کب نوکر نے آ کر مجھے بیڈٹی دی۔

تیار ہو کر نیچے آیا تو ماما نے بتایا کہ نہ صرف پاپا نے حاجی مقبول صاحب کو فون کر کے ان کے گھر آنے کی خواہش کا اظہار کیا ہے، بلکہ ہم لوگ آج سہ پہر کی چائے پر حاجی صاحب کے گھر مدعو ہیں۔ میرے اندر ایک دم ہی جیسے ستار کے بہت سے تار جھنجھنا اٹھے۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ جب تک مجھے اس جذبے کا دور اک نہیں تھا، تب تک میں اس کی کک اور تڑپ سے بھی انجان تھا اور اب، جب میں اس کا سرور و نشہ محسوس کر چکا تھا تو میرے لیے ایک ایک لمحہ کا کافی بھی دشوار ہو رہا تھا۔ دل چاہ رہا تھا کہ ماما پاپا فوراً ہی مقبول صاحب کے گھر چلے جائیں اور آج ہی واپسی پر کسی طرح زہرا کو اپنے ساتھ لے کر ہی واپس آئیں۔ خدا خدا کر کے دن کا دوسرا پہرہ ڈھلا اور پاپا نے ڈرائیور کو گاڑی نکالنے کو کہا۔ میں بھی جلدی سے سیڑھیاں پھلانگتا ہوا نیچے اتر لیکن پتا نہیں کیوں، میرا دل اچانک ہی بہت زور سے دھڑکنے لگا تھا۔ ماما نے میرے گال تھپتھپائے اور گاڑی میں پاپا کے ساتھ پچھلی سیٹ پر جا کر بیٹھ گئیں۔ پاپا نے میری جانب دیکھ کر ہاتھ ہلایا تو میرے منہ سے خود بخود نکل گیا۔ ”میٹ آف لک پاپا.....!“

گاڑی زن سے نکل گئی اور میں وہیں لان میں اپنے بے قابو دل کی دھڑکنیں سنبھالنے کے لیے بیٹھ گیا۔ میری حالت اس وقت پھانسی کے اس قیدی کی طرح تھی جسے یہ پتا ہو کہ چند گھنٹوں بعد اسے تختہ دار پر لٹکا دیا جائے گا۔ مجھے سادہ پانی کا گھونٹ بھی حلق سے اتارنا مشکل ہو گیا۔ فوراً ہی ابکائی سی آ گئی۔ وقت اپنی جگہ جیسے جامد سا ہو کر رہ گیا تھا۔ جانے کتنی صدیوں بعد شام ڈھلی اور مغرب کے وقت تک تو مجھے یوں لگنے لگا تھا جیسے آج میرا یہ جنون مجھے رسوا کر کے ہی چھوڑے گا۔ اچانک ہی گیٹ کے باہر پاپا کی گاڑی کا ہارن سنائی دیا اور چوکیدار نے جلدی سے آگے بڑھ کر گیٹ کے کھول دیا۔ میں گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔ گاڑی اندر پورچ میں آ کر رک گئی اور ماما اور پاپا نے قدم باہر رکھے، میں تقریباً دوڑتا ہوا، ان دونوں کے پاس جا پہنچا۔ ”کہاں رہ گئے تھے آپ دونوں.....؟ آخر اتنی دیر کہاں لگا دی.....؟“ میں نے ان کے اترتے ہی سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔ ماما نے کیوں



مجھ سے نظریں ملانے سے گریزاں تھیں۔ میں پاپا کی جانب لپکا۔ ”آپ ہی کچھ بتائیے ناپا۔۔۔ کوئی مسئلہ تو نہیں ہوا نا۔۔۔ سب ٹھیک تو ہے نا۔۔۔؟“

پاپا نے ایک گہری سی سانس لی اور میرے دونوں ہاتھ مضبوطی سے تھام لئے۔ ”ساحر بیٹا۔۔۔ اس لڑکی نے تمہارا رشتہ قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے۔۔۔ آئی ایم سوری۔۔۔ ہم دونوں مل کر بھی انہیں قائل نہیں کر سکے۔۔۔“ مجھے لگا، جیسے کچھ لمحوں کے لیے میری تمام سماعتیں مردہ ہو گئی ہوں، شاید میں پاپا کی بات ٹھیک سے سن ہی نہیں پایا تھا۔ بے یقینی سے انہیں پھر سے زور سے جھنجھوڑا، انہوں نے مجھے زور سے سمجھنے کر گلے لگا لیا۔ ایسا وہ بچپن میں بھی تب کیا کرتے تھے جب مجھے سائیکل سے گر کر، یا کھیلتے ہوئے کوئی زوردار چوٹ لگ جاتی تھی۔ چند لمحوں کے لیے مجھے کچھ سمجھ ہی نہیں آیا۔ پھر رفتہ رفتہ جب ان کی بات کا مفہوم واضح ہونے لگا تو چوٹ کا درد بھی دھیرے دھیرے رگوں کو کاٹنے لگا۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ اتنی زور سے چیوں کہ اندر کا سارا شور ایک ہی جھٹکے میں باہر آ جائے۔ ماما ہاں رک نہیں پائیں اور آنکھیں پونچھتی ہوئی تیزی سے اندر چلی گئیں۔

لیکن کیوں۔۔۔؟ زہرا نے انکار کیوں کر دیا تھا۔ میرا چند لمحوں کا ساتھ پانے کے لیے نہ جانے کتنی نازنینوں کا دل مچلتا تھا، لیکن وہ جسے میں نے عمر بھر کا ساتھ دینے کی پیشکش کی تھی، اس نے ایک ہی لمحے میں میرا سارا غرور، سارا بھرم چکنا چور کر دیا۔ کیوں۔۔۔ کیا وہ مجھے بھی ہزاروں عام لوگوں کی فہرست میں رکھتی تھی جو اس کی ایک جھٹک کے طلب گار ہوں گے۔۔۔؟ مجھے زندگی میں پہلی مرتبہ ٹھکرائے جانے کے اذیت ناک درد کا احساس ہوا۔۔۔ اس سے پہلے تو میں نے صرف جیتنا اور فتح کرنا سیکھا تھا اور میری فتوحات کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ اب تو مجھے نام اور چہرے بھی یاد نہیں رہے تھے۔ آج سے پہلے شاید یہ بات کسی نے میرے لیے ہی کہی تھی کہ ”وہ آیا، اس نے دیکھا اور فتح کر لیا۔“ لیکن آج کوئی مجھے دیکھتا تو صرف اتنا کہتا ”وہ آیا، اس نے دیکھا۔۔۔ اور ہار گیا۔“ کون سوچ سکتا تھا کہ بین الاقوامی تاجر، ملک کے مشہور انڈسٹریسٹ، فیڈرل چیئرمین آف کامرس کے صدر، توصیف احمد کے بیٹے کا رشتہ ٹھکرایا بھی جاسکتا ہے۔ میرے ذہن میں آندھیوں کے جھکڑ سے چل رہے تھے۔

پاپا نے میرا ہاتھ تھاما اور مجھے لیے لان میں بچھی کر سیوں کی طرف آگئے اور دھیرے دھیرے سارا ماجرا گوش کر دیا کہ حاجی مقبول اور ان کے تمام گھروالے بہت وضع دار لوگ ہیں۔ ماما اور پاپا کا استقبال ویسا ہی کیا گیا جیسا کہ ان کے شایان شان ہو سکتا تھا لیکن لڑکی کی ماں پہلے ہی سے کچھ بچھی بچھی سی تھی۔ شاید وہ ماما، پاپا کے آنے سے پہلے ہی ان کی آمد کا مقصد جان چکی تھی، لہذا جب پاپا نے زہرا کو اپنی بہنو بنانے کی خواہش کا اظہار کیا تو ان کو زیادہ حیرت نہیں ہوئی۔ حاجی مقبول نے پاپا سے کہا کہ ”وہ اپنی اکھوتی بیٹی سے بے حد محبت کرتے ہیں، لہذا وہ اس کی مرضی کے بغیر کوئی فیصلہ نہیں کر سکتے۔“ البتہ انہوں نے ماما اور پاپا کا اس بات پر بے حد شکریہ ادا کیا کہ اتنے بڑے خاندان نے ان کی بیٹی کو اتنی عزت دی۔ پاپا نے پھر اس بات پر اصرار کیا کہ اگر حاجی صاحب چاہیں تو اسی وقت اپنی بیٹی کی مرضی معلوم کر دیا جاسکتے ہیں۔ ماما میری تصویر لے کر گئی تھیں، انہوں نے وہ تصویر حاجی مقبول صاحب کی بیگم کے حوالے کی اور دم سادھے نتیجے کے انتظار میں بیٹھ گئیں۔ لیکن شاید زہرا کی ماں کو نتیجے کا پہلے ہی سے علم تھا، تب ہی وہ کچھ ہی لمحوں میں واپس آ گئیں۔ تب مجھے خیال آیا کہ ضروری تو نہیں کہ یہ رشتہ پہلا ہو، جو اس غزالہ کی چوکھٹ تک گیا تھا۔ مجھ سے پہلے بھی شاید یہ عمل دہرایا جا چکا ہو۔ بلکہ ایک بار نہیں، کئی بار یہ عذاب زہرا کے ماں باپ پر وارد ہو چکا ہو، تب ہی انہیں بیٹی کے انکار کا اس قدر کامل یقین تھا۔ زہرا کے انکار کے بعد ماما اور پاپا کا وہاں بیٹھے رہنے کا کوئی مقصد نہیں تھا، لیکن پھر بھی ماما نے ایک آخری کوشش کے طور پر زہرا سے ملنے کی خواہش کا اظہار

کیا۔ زہرا کی ماں نے ماما کو ساتھ لیا اور اس کے کمرے تک جا پہنچیں اور پھر ماما کو دروازے تک چھوڑ کر، خود وہیں سے واپس پلٹ گئیں، شاید ماما کو زہرا سے کھل کر بات کرنے کا موقع دینے کے لئے۔ ماما نے زہرا کو دیکھا تو بقول ان کے وہ اسے دیکھتی ہی رہ گئیں۔ اس کا حسن ہی ایسا دل موہ لینے والا تھا، لیکن وہ دل رہا اس وقت بھی غم و یاس کی مکمل تصویر بنی بیٹھی تھی۔ اس نے ماما کے کچھ بولنے سے پہلے ہی ہاتھ جوڑ کر ان سے معافی مانگ لی کہ اگر اس کے انکار سے ماما کا دل دکھائے تو وہ تہہ دل سے ان سے معذرت چاہتی ہے، لیکن اس مدعا کو مزید نہ ہی چھیڑا جائے تو بہتر ہوگا، کیونکہ اس کا فیصلہ اٹل ہے۔ اس نے ماما کے ہاتھ تمام کر ان سے یہ بھی کہا کہ جوڑی کی بھی ان کی بہو بنے گی، وہ دنیا کی سب سے زیادہ خوش قسمت لڑکی ہوگی۔ لیکن وہ خود کو اس اعزاز کے قابل نہیں سمجھتی، لہذا اسے اس کی بد نصیبی کا مزید احساس نہ دلا کر ماما پر احسان کریں گی۔ ظاہر ہے اس بات کے بعد ماما مزید کیا کہہ سکتی تھیں۔ وہ زہرا کے سر پر ہاتھ پھیر کر اور شگون کے طور پر سونے کے جوڑاؤنگلن ساتھ لے کر گئی تھیں، وہ زہرا کے سر ہانے چھوڑ کر چلی آئیں۔

پاپا نے مجھ سے وعدہ لیا میں ایسا کوئی کام نہیں کروں گا، جس سے ہمارے، یا زہرا کے خاندان کے نام پر کوئی حرف آئے۔ میں پاپا کو کوئی جھوٹی تسلی نہیں دینا چاہتا تھا، اس لیے چپ چاپ اٹھ کر کمرے میں آ کر بستر پر لیٹ گیا۔ اب یہ قصہ اتنی آسانی سے ختم ہونے والا نہیں تھا۔ مجھے اسے جیتنا تھا، یا پھر اپنی ہار کی وجہ معلوم کرنی تھی۔ البتہ میں نے پاپا کی بات کا اتنا مان ضرور رکھا کہ میں نے براہ راست زہرا کے گھر جانے سے احتراز کیا۔ ورنہ میرا دل تو یہی چاہ رہا تھا کہ میں بنا کہیں رکے، اس کے گھر کا دروازہ کھولوں اور سیدھے جا کر اس کے سامنے کھڑا ہو جاؤں۔ جمہرات آنے میں ابھی دو دن باقی تھے اور یہ دو دن میں نے کس طرح کاٹے، یہ میں ہی جانتا ہوں۔

تیسرے دن میں نے گاڑی نکالی اور ماما کی آوازوں کی پروا کئے بنا تیزی سے گاڑی دوڑاتا ہوا ساحل کی جانب نکل پڑا۔ عبداللہ مجھے درگاہ کی سڑکیوں پر ہی مل گیا۔ شاید وہ قریبی بستی سے اپنی ضرورت کی کچھ چیزیں لینے کے لیے درگاہ سے باہر نکلا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس کے چہرے پر خوشی کے تاثرات پھیل گئے۔ تب مجھے احساس ہوا کہ اس دن بے ہوش ہونے کے بعد میں نے بے سروقی کی انتہا ہی تو کر دی تھی۔ مجھے کم از کم عبداللہ کا شکریہ ادا کرنے کے لیے تو ایک بار یہاں آنا چاہئے تھا، لیکن عبداللہ نے اپنے رویے سے ذرا بھر بھی احساس نہیں ہونے دیا کہ ہم اتنے دن بعد مل رہے ہیں۔ میں نے عبداللہ سے کہا کہ مجھے کسی کا انتظار ہے۔ وہ اوپر درگاہ میں میرا انتظار کرے، میں وہیں آ کر اس سے تفصیلی ملاقات کروں گا۔

عبداللہ سر ہلا کر اوپر چلا گیا اور میں نے وہیں پتھر لی سڑکیوں کے پہلے پائیدان پر ڈیرہ جمالیا۔ لوگ سبزھیاں اترتے، چڑھتے رہے اور میں ان کے قدموں سے الجھتا رہا، لیکن آج میں نے وہاں سے نہ اٹھنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ جانے مجھے یونہی لوگوں کی ٹھوکروں میں بیٹھے کتنی دیر گزری تھی کہ اچانک ہی دور سے مجھے زہرا کی گاڑی ریت اڑاتی درگاہ کی جانب آتی دکھائی دی۔ مجھے یوں لگا کہ ایک ہی لمحے میں میرے جسم کا سارا خون میری کن ٹیوں کی جانب دوڑنے لگا ہو۔ میں پہچانی کیفیت میں کھڑا ہو گیا۔ گاڑی قریب آ کر رک چکی تھی اور اس میں سے حسب معمول وہی پرانی خادمہ، زہرا کی ماں اور خود زہرا اتر رہی تھیں۔ سب سے آگے زہرا کی ماں، پھر زہرا اور پھر سب سے پیچھے زہرا کی خادمہ دھیرے دھیرے چلتے ہوئے درگاہ کی سڑکیوں کی طرف بڑھ رہے تھے۔ بھیڑ کی وجہ سے ان میں سے کسی کی نظر اب تک مجھ پر نہیں پڑی تھی۔ جیسے ہی زہرا کی والدہ نے مجھے کراس کیا، میں ایک دم زہرا کے بالکل اور عین سامنے آ کر کسی چٹان کی طرح جم گیا۔ زہرا جو اپنی ہی دھن میں سر جھکائے آگے بڑھ رہی تھی، ایک دم ٹھٹھک کر



رک گئی اور غصے میں کچھ کہنے ہی لگی تھی کہ میرے چہرے پر نظر پڑتے ہی اس کے لفظ اس کے سینے میں ہی گھٹ کر رہ گئے۔  
 میں سرسراتی ہوئی آواز میں بولا۔  
 ”مجھے آپ سے کچھ پوچھنا ہے.....“



**We at Paksociety.com giving you the facility to download urdu novels,Imran series,Monthly digests with direct links and resumeable direct link along with the facility to read online on different fast servers**

**If site is not opening .or you find any issue in using site send your complaint at admin@paksociety.com**

**or**

**send message at  
0336-5557121**

## نظر کی التجا

اس وقت شاید خود زہرا کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوگا کہ میں یوں ایک دم اچانک اور سرراہ اس کا راستہ روک لوں گا۔ چند لمحے تو وہ کچھ بول ہی نہیں پائی۔ اس کے ماتھے پر غصے اور جھنجھلاہٹ کے مارے چند شکنیں ابھریں اور پسینے کی چند شکنیں بوندیں پھسل کر ستارہ پلکوں کو بھگو گئیں۔ زہرا کی والدہ چونکہ پہلے میڑھیاں چڑھ چکی تھیں، لہذا انہیں اپنے پیچھے ہوئی اس واردات کی فی الحال خبر نہ تھی۔ ویسے بھی وہاں اس وقت زائرین کا اس قدر ہجوم تھا کہ کوئی زائر یہ بھی محسوس نہیں کر پایا کہ میں دن دہاڑے کسی عفت مآب کا راستہ روکے کھڑا ہوں۔ زہرا نے دوبارہ نگاہیں اوپر نہیں اٹھائیں اور اسی طرح جھکے سر کے ساتھ لیکن لمبے میں شدید سختی لیے مجھے کہا۔ ”راستہ چھوڑیں میرا..... آپ ایک اچھے گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں آپ کو یہ سب زیب نہیں دیتا.....“ میں اپنی جگہ پر جم رہا۔ ”جب تک آپ میرے سوال کا جواب نہیں دیں گی تب تک میں یہاں سے کہیں نہیں جاؤں گا۔“ اس کی خادمہ سراسیمہ سی پیچھے کھڑی سارا مارا دیکھ رہی تھی۔ اس کے ذہن میں یہ خیال بھی ضرور کھلبلی مچا رہا ہوگا کہ اس کی بڑی مالکن اوپر درگاہ میں صحن میں کھڑی پریشان ہو رہی ہوں گی کہ یہ دونوں پیچھے کہاں رہ گئیں؟ زہرا زچ ہو کر بولی۔ ”آخر ایسی کون سی ضروری بات ہے جس کے لیے آپ یوں.....“ میں نے درمیان ہی میں اس کی بات کاٹ دی ”آپ نے رشتے سے انکار کیوں کیا.....؟ آخر مجھ میں ایسی کون سی کمی ہے، جو آپ کو کھلتی ہے.....؟“ ”یہ میرا ذاتی معاملہ ہے آپ میں کوئی کمی نہیں ہے..... لیکن مجھے اس بات کا پورا حق حاصل ہے کہ میں اپنی زندگی کا فیصلہ خود کروں۔“ اس کی بات نامکمل رہ گئی اور اتنے میں بھینڑ کا ایک تیز ریلا آیا اور مجھے اپنی جگہ سے دھکیل گیا۔ زہرا کو آگے بڑھنے کا موقع مل گیا۔ خادمہ بھی اس کے پیچھے لپکی۔ میں نے پیچھے سے چلا کر کہا، ”ٹھیک ہے، بات اگر زندگی کے فیصلے اور اس پر قائم رہنے کی ضد کی ہے تو پھر میں بھی آپ کو ہر جمعرات اسی درگاہ کی جو کھٹ پر پڑا ملوں گا دیکھتے ہیں آپ کی خاموشی پہلے ٹوٹتی ہے، یا پھر میری سانسوں کی ڈور.....“ زہرا اپنا پیچھے دیکھے اور بنا جواب دیئے تیزی سے درگاہ کی میڑھیاں چڑھ گئی۔ اس وقت میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں اس ساری دنیا کو آگ لگا دوں۔ میں اس دن کو رو رہا تھا جب پہلی بار میرے قدم اس درگاہ کی جانب اٹھے تھے۔ نہ میں یہاں آتا، نہ میری زہرا پر نگاہ پڑتی اور نہ ہی آج میری یہ حالت ہوتی۔ میں تو بھکاریوں سے بھی بدتر ہو گیا تھا۔ انہیں تو پھر بھی مانگنے پر کچھ نہ کچھ مل ہی جاتا تھا، پر مجھے تو ڈھنگ سے مانگنا بھی نہیں آتا تھا۔ اسی جھنجھلاہٹ میں اور خود کو کوستا ہوا میں جانے کب درگاہ کے احاطے میں پہنچ گیا۔

زہرا اپنی ماں کے ساتھ حسب معمول دعاؤں میں مشغول تھی۔ ایک لمحے کے لیے میرا دل پھر سے ڈوبا لیکن میں دور گھڑوں کے پاس سائے میں بیٹھے عبداللہ کی جانب بڑھ گیا۔ عبداللہ کے سامنے بہت سی چھوٹی سیبیوں اور موتیوں کا ایک ڈھیر پڑا ہوا تھا، جن میں سے ایک ایک دانہ اٹھا کر وہ تسبیح بن رہا تھا۔ اس نے خوش دلی سے میرا استقبال کیا۔ ”آؤ سارمیاں آؤ..... دیکھو میں نے تمہارے لٹی یہ تسبیح بنی ہے.....“ عبداللہ نے ایک



چھوٹی سی مگر بے حد خوبصورت تسبیح اٹھا کر مجھے دی۔ میں اپنے اندر کی تخلیقی کو اپنی زبان پر آنے سے نہ روک سکا۔ ”لیکن میں اس کا کیا کروں گا.....؟“ میں نے تو آج تک کبھی تسبیح پڑھی ہی نہیں.....“ ”ارے تو کیا ہوا..... آج نہیں تو کل..... کل نہیں تو پرسوں..... کبھی نہ کبھی تو دل چاہے گا نا.....؟“ تب تسبیح تمہارے کام آئے گی۔“ ”شاید اس کی نوبت کبھی نہ آئے..... اور پھر اگر کبھی میرا دل تسبیح پڑھنے کو چاہا بھی تو میں یوں دانوں پر گن گن کر نہیں پڑھوں گا، خدا کی یاد میں یہ مول تول کیسا.....؟ اس کی شان میں تسبیح پڑھنی ہو تو پھر یہ گنتی کیسی.....؟“ عبداللہ نے چونک کر سر اٹھایا اور پھر کچھ دیر مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھتا رہا۔ ”بہت بڑی بات کہہ دی تم نے..... ہاں..... معاملہ جب اس کی یاد کا ہو تو پھر یہ گنتی کیسی..... لیکن مجھ جیسے عام بندے تو اس کی یاد میں بھی اس گنتی کا ڈھکوسلا شامل کر ہی دیتے ہیں..... اور پھر یہ تسبیحاں بننا تو ویسے بھی میری مجبوری ہے کیوں کہ میرے روزگار کا فقط یہی ایک ذریعہ ہے۔“ ”کیا مطلب؟ کیا تم تسبیح کی یہ مالا میں فروخت بھی کرتے ہو.....؟“ عبداللہ میری حیرت دیکھ کر مسکرایا۔ ”جی ساخر میاں..... آخر اپنا اور اپنے بیوی بچوں کا پیٹ بھی تو پالنا ہوتا ہے۔“ ”مجھے حیرت کا ایک اور جھٹکا لگا۔“ ”تمہاری بیوی اور بچہ..... کیا تم شادی شدہ ہو.....؟“ ”کیوں..... اس میں حیرت کی کیا بات ہے..... کیا میں شادی شدہ نہیں ہو سکتا.....“ میں گڑ بڑا سا گیا..... ”نہیں میرا یہ مطلب نہیں تھا..... دراصل ایسی درگاہوں اور ان میں بسنے والوں کو دیکھ کر ہمیشہ ساری دنیا تیاگ دینے والی کسی مخلوق کا خیال آتا ہے، شاید اسی لیے مجھے حیرت ہو رہی ہے.....“ ”جانے مجھ جیسے ہر مجاور، یادگارہ کے متولی کو دیکھتے ہی لوگ اپنے آپ یہ کیسے باور کر لیتے ہیں کہ ہم ساری دنیا تیاگ کر یہاں آ بیٹھے ہوں گے جب کہ ہمارے مذہب میں واضح طور پر رہبانیت سے منع کیا گیا ہے۔ میں نے تمہیں پہلے بھی بتایا تھا کہ یہ درگاہ میرے سفر کا بس ایک پڑاؤ ہی تو ہے۔“ ”اور تمہارے بیوی بچے.....؟ وہ کہاں رہتے ہیں..... شادی کب ہوئی تمہاری.....؟“ ”تین سال ہو گئے ہیں میری شادی کو..... ایک بیٹا ہے میرا..... احمد نام ہے اس کا..... پچھلے ہفتے ہی ماشاء اللہ پورے دو سال کا ہوا ہے..... میری بیوی اور بچہ یہاں سے تقریباً ایک سو بیس کلومیٹر دور چھوٹے سے گاؤں میں رہتے ہیں۔ میں ہر پندرہ سواڑے پر ان سے ملنے جاتا ہوں..... حاکم بابا مجھ پر خاص مہربان ہیں اس لیے عید، شبِ برات اور دیگر چھٹیاں بھی انہیں کے ساتھ اپنے گھر میں مناتا ہوں۔“ عبداللہ بولتا جا رہا تھا اور میں حیرت میں ڈوبا سن رہا تھا۔ یہ شخص ہر کروٹ پر میرے لیے اپنے اندر سے خیر اور تجسس کی ایک پوٹلی لیے برآمد ہوتا تھا۔

میں عبداللہ کی باتوں میں اس قدر کھویا ہوا تھا کہ مجھے زہرا اور اس کی ماں کے اٹھنے کا پتا ہی نہیں چلا..... میں اس وقت چونکا جب اس عشوہ طراز کے نازک قدم میرے سامنے سے گزرے، میں نے چونک کر جلدی سے نظر اٹھائی اور پل بھر ہی میں یہ کیا غضب ہو گیا، اس راج ہنسی کی ترچھی نظر بے خیالی میں میری جانب اٹھی اور لمبے کے ہزارویں حصے میں میری روح کے خرمن کو جلا کر خاکستر کر گئی۔ اس نے عبداللہ کی جانب نظر بدل کر عبداللہ کو دھیرے سے سلام کیا اور آگے بڑھ گئی اور میرے دل کو جو چند لمحوں کا قرا میرا آ یا تھا، وہ سب چین، قرار اپنے ساتھ ہی لوٹ کر لے گئی۔ میرا جی چاہا کہ آگے بڑھ کر اس کا راستہ روک لوں اور تب تک نہ جانے دوں، جب تک وہ تھک کر تھیا نہ ڈال دے لیکن میں اپنی جگہ سے حرکت بھی نہیں کر سکا اور وہ درگاہ کے احاطے سے نکل گئی۔ عبداللہ غور سے میرے چہرے پر آتی جاتی اس دھوپ چھاؤں کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے آہستہ سے کھنکار کر میرے خیالات کا تسلسل توڑ دیا۔ ”میں نے ایک بات محسوس کی ہے کہ تم جب بھی اس لڑکی کو دیکھتے ہو، کسی اور ہی دنیا میں پہنچ جاتے ہو۔ اس دن

اسے پانی پلاتے وقت بھی تمہاری حالت کچھ ایسی ہی تھی۔“ میں نے چونک کر عبداللہ کی جانب دیکھا، گویا سارے زمانے کو میری حالت کی خبر تھی، صرف میں ہی خود اپنے آپ سے بے خبر تھا۔ ”گچی بات تو یہ ہے کہ میں صرف اس لڑکی کی ایک جھلک پانے کے لیے ہی آج تک اس درگاہ کے چکر کا قارہا ہوں لیکن آج بھی میں اس سے اتنا ہی دور ہوں، جتنا پہلے دن تھا۔“ عبداللہ ہلکے سے مسکرایا۔ ”محبت کرتے ہو اس لڑکی سے.....؟“ میں نے گہری سی سانس لے کر آنکھیں بند کر لیں۔ ”جانے کیا ہے..... محبت، یا کچھ اور..... اس سے بھی سوا ہے..... کبھی کبھی لگتا ہے کہ صرف اور صرف درد اور بے چینی کا رشتہ ہے..... میں نے اپنی پوری زندگی میں اتنی اذیت آج تک کبھی محسوس نہیں کی..... جانے یہ کیسی محبت ہے.....؟ اور اگر یہی وہ جذبہ ہے جس کے اظہار کے لیے شاعروں نے دیوان کے دیوان لکھ مارے ہیں تو ایسے تمام دیوان، تمام کتب خانوں کو آگ لگا دینی چاہئے جو اس جذبے کی خوب صورتی اور حمایت بیان کرتے ہیں۔“ عبداللہ میری بات سن کر ہنس دیا۔ ”ارے..... ابھی سے گھبرا گئے..... شاید تم نے غالب کو زیادہ نہیں پڑھا..... چچا غالب نے تو پہلے خبردار کر دیا تھا کہ۔

یہ عشق نہیں آساں، بس اتنا سمجھ لیجئے  
اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے

ویسے کچھ جگہوں پر تیر کر جانا بھی درج ہے.....“

میں نے غور سے عبداللہ کو دیکھا ”تم نے آج تک کبھی کھل کر نہیں بتایا کہ تم کتنا پڑھے ہو..... میرا مطلب ہے کوئی ڈگری وغیرہ.....؟“ ”کیا کوئی سند ہی انسان کی شخصیت کی پہچان ہوتی ہے.....؟ بہر حال تم نے تیسری مرتبہ یہ سوال پوچھا ہے تو بتائے دیتا ہوں..... میں نے اردو ادب میں ماسٹر کیا ہے۔“ یہ ایک اور جھٹکا تھا جو اس دن میں نے سہا۔ ویسے عبداللہ کے معاملے میں تو اب تک مجھے ان سر پرانز کا عادی ہو جانا چاہئے تھا لیکن میں پھر بھی چونکنے سے باز نہیں آتا تھا۔

اس جمعرات کے بعد میرا یہ معمول ہو گیا تھا کہ ہر جمعرات خصوصی طور پر زہرا کو دیکھنے اور اس کی راہ میں بیٹھ کر اپنا سوال پھر سے دہرانے کے لیے درگاہ کے دروازے پر اس وقت تک کھڑا رہتا جب تک وہ وہاں سے اندر داخل نہ ہوتی..... البتہ اب میں نے اس کا راستہ روکنے، یا اس سے کوئی بات کرنے کی کوشش کا عمل ترک کر دیا تھا۔ زہرا کی ماں کو بھی اب اس حقیقت کا ادراک ہو چکا تھا کہ میں خاص زہرا کے لیے ہی ہر جمعرات درگاہ کی سنگی سیڑھیوں پر ڈیرہ جمانا ہوں اور خاموشی سے اس وقت تک وہاں بیٹھا رہتا ہوں جب تک وہ نایم پری درگاہ سے واپس لوٹ نہیں جاتی۔ پہلی مرتبہ تو زہرا کی والدہ مجھے وہاں اس اجڑی حالت میں بیٹھا دیکھ کر بالکل گھبرا گئیں، میری شیوہ بڑھ چکی تھی اور جینز اور شرٹ بھی بالکل ملگجی ہو رہی تھیں۔ ان کی آنکھیں بھر آئیں۔ منہ سے کوئی لفظ نہیں نکل سکا اور بہت دیر تک گم صم کھڑی رہی۔ میں ان سے نظر نہیں ملا پایا اور وہ میرے سر پر ہاتھ رکھ کر سیڑھیاں چڑھ گئیں۔ لیکن اگر میں زہرا کی ماں سے نظر نہیں ملا پایا تھا تو دوسری جانب زہرا بھی میری طرف دیکھنے سے احتراز کرتی اور تیزی سے آگے بڑھ جاتی۔ رفتہ رفتہ میری نظر کی اس التجا اور زہرا کی نظر کے اس بے رحم احتراز کا یہ کھیل ہمارا معمول ہی بنتا گیا۔ ایک جمعرات کے بعد دوسری جمعرات آتی گئی اور میں اپنی ہر التجا، اپنی ہر بے بسی اور اپنی ہر طاقت اپنی اس ایک نظر میں سموتا گیا جو درگاہ کی ان سیڑھیوں پر بیٹھے ہر جمعرات میں اس



سنگ دل کے قدموں میں نچھاور کرتا تھا لیکن اس سنگ مرمر کی صورت کو پگھلنا تھا، نہ وہ پگلی۔ لیکن میں نے بھی نظریں اس خاموش جنگ کو اس کے منطقی انجام تک لڑنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ میری پڑھائی، دوست اور رنگا رنگ زندگی کی ہر خوشی، مصروفیت مجھ سے چھن چکی تھی۔ ماما اور پاپا دن رات میری حالت دیکھ کر کڑھتے اور جلتے رہتے تھے۔ لیکن وہ دونوں بھی میری ضد اور جنون سے اچھی طرح واقف تھے، اس لیے ماما کے دن رات بہتے ہوئے آنسو بھی مجھے میری دیوانگی کی راہ سے نہیں ہٹا سکے۔

پھر ایک جمعرات اک عجیب سی بات ہوئی۔ اب میں نے درگاہ کے اندر جانا تقریباً موقوف ہی کر دیا تھا اور زہرا کے آنے سے پہلے درگاہ کی بیرونی سیڑھیوں پر بیٹھ جاتا تھا۔ جب زہرا آ کر اوپر درگاہ میں چلی جاتی، تب بھی اس وقت تک باہر ہی بیٹھا رہتا اور زہرا کی واپسی کا انتظار کرتا۔ وہ پلٹ کر واپس چلی جاتی تو میں اپنے گھر کی راہ لیتا۔

ایک ایسے ہی دن، میں تہتی دھوپ میں بیٹھا زہرا کی راہ تک رہا تھا اور جانے کن خیالوں میں کھویا ریت پر آڑی ترچھی لکیریں کھینچ رہا تھا..... کہ اچانک ایک کڑک دار آواز سن کر چونک کر نظریں اٹھائیں۔ کچھ دیر تک تو سورج کی کرنوں سے چندھیائی ہوئی میری نظریں اس شخص کے خاکے کو پہچان ہی نہیں پائیں، جو میرے سر پر کھڑا شعر پڑھ رہا تھا۔

تیرا چہرہ ہے جب سے آنکھوں میں  
میری آنکھوں سے لوگ جلتے ہیں

اور جب اس شخص کا چہرہ واضح ہوا تو میں حیرت سے اچھل ہی تو پڑا، وہ حاکم بابا تھا۔ آج ان کی آنکھوں سے اس روایتی جلال کی جگہ ایک عجیب سی نرمی چھلک رہی تھی۔ میں گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔ انہوں نے شفقت سے میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور کچھ دیر تک مجھے غور سے دیکھتے رہے۔ میں نے حسب معمول ان کی آنکھوں کی چمک کی تاب نہ لا کر اپنی آنکھیں جھکا لیں۔ ”تو اندر کیوں نہیں آتا لڑکے..... یہاں باہر کیا بازار سجا رکھا ہے.....؟ کسے بھسم کرنا چاہتا تھا.....؟ وہ تو خود جل کر پہلے ہی راکھ ہو چکی ہے۔“ میں نے چونک کر نظر اٹھائی..... گویا انہیں بھی میرے فسانے کا علم تھا۔ پتا نہیں اور کتنے لوگ ہوں گے جو میری اس وحشت سے واقف ہوں گے۔ صرف اسی کو اب تک خبر نہ ہو سکی تھی جس کے لیے میرا یہ سارا جنون تھا۔ میں نے دھیرے سے سر جھکا کر انہیں جواب دیا۔ ”میرا دل نہیں چاہتا اندر آنے کو..... اور پھر اس دن آپ نے ہی تو کہا تھا کہ اپنے نفس کے پیچھے بھاگنے والوں کے لیے اس درگاہ کے احاطے میں کوئی جگہ نہیں ہے۔“ حاکم بابا مسکرائے ”لگتا ہے تو نے ہماری بات دل پہ لے لی ہے..... چل آج سے ہم خود تجھے اجازت دیتے ہیں، جب کبھی دل چاہے تو اوپر آ جانا..... پر یاد رکھ..... دل کسی کا دوست نہیں ہوتا..... اس کی نہ دوستی بھلی اور نہ ہی دشمنی اچھی.....“ حاکم بابا کا یہ روپ میں نے آج تک کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اتنی نرمی، حلاوت تو کبھی نہ تھی ان کے لہجے میں۔ وہ بوجی مسکراتے ہوئے اپنے چند مریدوں کے ساتھ اوپر درگاہ کی جانب بڑھ گئے۔ کچھ ہی دیر میں اوپر سے ایک زائر ہاتھ میں ایک رقعہ اور چند کھجوریں لے کر نیچے اتر اور دونوں چیزیں دل کو میرے حوالے کر کے واپس لوٹ گیا۔ میں نے خط کھولا تو عبداللہ کی تحریر تھی۔ ”کہو ساحر میاں.....؟ آخر ہمارے حاکم بابا پر بھی اپنا سحر پھونک ہی ڈالا؟ یہ چند کھجوریں خود انہوں نے تمہارے لیے بھجوائی ہیں..... کہتے ہیں اس دل جلے کے لیے بھجوادو، جو نیچے دھوپ میں بیٹھا سورج کے

ساتھ اپنے مقدر کی جنگ لڑ رہا ہے..... بھئی واہ..... ایسی مہربانی تو آج تک حاکم بابا نے ہم میں سے کسی پر بھی نہیں کی..... جیتے رہو..... تمہارا دوست..... عبداللہ“

عبداللہ کی تحریر نے چاہے چند لمحوں کے لیے ہی سہی، میرے ہونٹوں کو ایک ہلکی سی مسکراہٹ ضرور بخش دی تھی۔ اس نوجوان کو گفتگو کا نایاب فن آتا تھا اور سب سے زیادہ آسانی اور سہولت سے ہم اگر کسی دوسرے کو کوئی خوشی دے سکتے ہیں تو وہ ہماری باتیں ہی تو ہیں۔ سچ ہے کہ یہ صرف لفظ ہی ہیں، جو سب کچھ بنانے اور بگاڑنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ میں ابھی عبداللہ کی تحریر کے تانے بانے ہی میں الجھا ہوا تھا کہ اچانک ہی مجھے اسی تیزی سے پردائی کے چلنے کا احساس ہوا جو ہمیشہ مجھے زہرا کی آمد کے وقت محسوس ہوتی تھی۔ میں نے چونک کر سر اٹھایا تو اس زہرا جیوں کی گاڑی آ کر رک چکی تھی اور وہ اپنی خادمہ کے ساتھ گاڑی سے اتر کر سیڑھیوں کی جانب بڑھ رہی تھی۔ لیکن آج زہرا کی ماں اس کے ساتھ نہیں تھی۔ نہ جانے کیوں.....؟ میں حسب معمول اور حسب توقع اس انتظار میں اس کی جانب دیکھ رہا تھا کہ کب وہ ہمیشہ کی طرح میری نظر سے بچتی ہوئی اور بنا میری طرف دیکھے، درگاہ کی سیڑھیاں چڑھتی ہے۔ لیکن یہ دیکھ کر میرے جسم سے جیسے ساری جان ہی نکل گئی کہ اس کا رخ سیدھا میری ہی جانب تھا۔ وہ غصے میں تنٹائی ہوئی میری جانب بڑھی چلی آئی اور میں سامنے آ کر کھڑی ہو گئی اور پھر اس کے یا تو قوی لب بولے..... ”آخر آپ مجھ سے چاہتے کیا ہیں.....؟“ اس طرح مجھے بدنام کر کے آپ کو کیا مل جائے گا.....؟“



ڈاٹ کام



## رقیب

اتنی صدیوں کے بعد اس نازک ادا کے نازک لب ہلے بھی تو ایک شکوے کے لیے..... غصے سے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور پلکیں لرز رہی تھیں۔ میری نظر چند لمحوں کے لیے اس کی نظر سے ٹکرائی تو اس نے جھجک کر اپنی پلکیں جھکا لیں۔ ”یہ آپ سے کس نے کہا کہ مجھ جیسا سر راہ بیٹھا دیوانہ بھی کبھی کسی کی بدنامی کا باعث بن سکتا ہے.....؟ اور پھر آپ کو بدنام کرنا ہی میرا مقصد ہوتا تو میں یہاں اس درگاہ کے باہر بیٹھنے کے بجائے آپ کے گھر کے باہر اپنا ڈیرا جاتا..... یہاں تو اس پاس مجھ جیسے جانے اور کتنے مقدر جلے اپنی اپنی قسمت کی دھوپ سینک رہے ہیں..... پھر آپ کو مجھی سے شکوہ کیوں ہے.....؟“

وہ غصے سے بولی ”آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ مجھے یہ شکایت کیوں ہے۔ آپ کی اس ضد اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے امی اتنی پریشان ہو گئی ہیں کہ انہوں نے بستر پکڑ لیا ہے۔ وہ اتنی بیمار ہیں کہ آج میرے ساتھ درگاہ تک آنے کی طاقت نہیں تھی ان میں..... آپ کیا سمجھتے ہیں کہ یہاں اس پاس بسنے والے سبھی لوگ بہرے، گونگے، یا اندھے ہیں، جنہیں کچھ نظر نہیں آتا.....؟ افسوس تو اس بات کا ہے کہ آپ نے ایک غلط مقصد کے لیے اس درگاہ جیسی پاک جگہ کا انتخاب کیا ہے..... شاید آپ مجھے رسوا کر کے اپنی اس ہزیمت کا بدلہ چکانا چاہتے ہیں جو آپ کی ناقص رائے میں میرے انکار کی وجہ سے آپ کو اٹھانا پڑی ہے۔“ اس کے لفظوں کی کئی آریاں میرے دل پر چل گئیں۔ گویا میری ساری تپش کو ایک گھٹیا انتقام کا نام دیا جا رہا تھا۔ وہ ایسا کیسے سمجھ سکتی تھی۔ میں اپنے جذبے کی تذلیل پر ایک لمحے کے لیے جیسے سب کچھ بھول گیا اور ایک جھٹکے سے کھڑے ہو کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دل ہی باہر الٹ دیا۔ ”مجھے آپ کی والدہ کی پریشانی اور بیماری کا سن کر نہایت افسوس ہوا ہے۔ کاش میں بھی آپ کی طرح اپنی اس ساری بربادی کا الزام آپ پر ڈال سکتا۔ لیکن افسوس میں تو اتنا مجبور ہوں کہ آپ کو مورد الزام بھی نہیں ٹھہرا سکتا۔ یہ جو کچھ بھی ہو رہا ہے، اس پر خود میرا اختیار نہیں ہے۔ مجھے کون سا جذبہ کھینچ کر یہاں لا بیٹھاتا ہے، میں خود اس سے اب تک ان جان ہوں۔ کاش میرا اپنے آپ پر کوئی اختیار ہوتا تو میں کبھی خود کو یوں سر بازار رسوا نہ ہونے دیتا۔“ وہ مزید زچ ہو گئی۔ ”لیکن یہ تو زبردستی ہے۔ آپ کا جذبہ کسی دھونس دھمکی کی طرح میری راہ میں رکاوٹیں کھڑی کر رہا ہے۔ بات اگر اختیار کی ہے تو میں خود بھی بے اختیار ہوں اور آپ میری بے خودی کے راستے میں زبردستی آ کھڑے ہوئے ہیں۔“ مجھے اس کم گو سے اتنی بات کی امید بھی نہ تھی لیکن خلاف توقع اس کے پاس لفظوں کا ذخیرہ وسیع تھا۔ ”آپ میرے سوال کا جواب دے دیں، میں آپ کی راہ سے ہٹ جاؤں گا۔“ لیکن اس نے بھی جیسے میری ضد کے سامنے ہتھیار ڈالنے سے پہلے اپنی شرط منوانے کا تہیہ کر رکھا تھا۔ ”ٹھیک ہے لیکن آپ کو بھی ایک وعدہ کرنا ہو گا کہ میرے جواب کے بعد آپ کوئی دوسرا سوال نہیں کریں گے اور آئندہ میری راہ میں اپنے کسی جذبے کی داپور نہیں کھڑی کریں گے۔“ میں جانتا تھا کہ وہ کسی بھی جواب سے پہلے میرے ارد گرد اپنے بھرم کا آہنی قلعہ ضرور تعمیر کرے گی لیکن اس کی

بات مان لینے کے علاوہ اس وقت میرے پاس اور کوئی چارہ بھی تو نہیں تھا۔ ”ٹھیک ہے۔۔۔۔۔ میں وعدہ کرتا ہوں“ ہمارے ارد گرد زائرین کا ہجوم سیڑھیاں چڑھ اور اتر رہا تھا اور اس پاس عصر کے وقت درگاہ پر دی جانے والی ایک مخصوص جڑی بوٹی کا دھواں پھیلا ہوا تھا۔ ہم اتنی دیر سے وہیں درگاہ کے باہر کھڑے باتیں کر رہے تھے لیکن وہاں کسی کو ہم پر توجہ دینے کی فرصت ہی کہاں تھی۔ زہرا نے نقاب اپنے چہرے پر ڈال کر اسے پوری طرح ڈھک لیا۔ ”میں نے آپ کو پہلے بھی کہا تھا کہ آپ کے رشتے سے انکار کی وجہ آپ کی ذات میں کوئی کمی، یا خرابی نہیں ہے۔ آپ ایک اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتے ہیں، پڑھے لکھے ہیں اور کسی بھی لڑکی کی خوش بختی ہوگی کہ وہ آپ کے گھر کی بہو بن سکے لیکن میری قسمت میں کاتب تقدیر نے یہ سکھ نہیں لکھا۔ میری نظر میں کوئی اور سا چمکے اور دل کے سودوں میں زبردستی نہیں چلتی ساحر صاحب۔۔۔۔۔ امید ہے آپ کو اپنے سوال کا جواب مل گیا ہوگا اور اب آپ بھی اپنا وعدہ پورا کریں گے۔“ میرے دل پہ جیسے ایک ہی لمحے میں کئی قیامتیں آ کر گزر گئیں۔ میں وہیں کھڑے کا کھڑا رہ گیا اور وہ جانے کب کی سیڑھیاں چڑھ کر آگے بڑھ چکی تھی، حالانکہ میں گزشتہ کئی ہفتوں سے اسے یہاں اپنی کسی منت کے سلسلے میں آتے جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا اور اس کی حالت ابتر، خود اس کا فسانہ سناتی تھی کہ ہونہ ہو، معاملہ یہاں بھی کچھ دل کا ہی ہے۔ لیکن آج اس کی زبانی اس کھلے اقرار نے جیسے میرے وجود کے اندر آگ سی بھردی تھی۔ اس ان دیکھے رقیب کی رقابت اور رشک کے طے جلے جذبات نے میرے دل میں ایک طوفان سا برپا کر دیا تھا۔ کیا کوئی اس دنیا میں اتنا خوش نصیب بھی ہو سکتا ہے، جس کے لیے زہرا جیسی پری، خود منت مانگنے کے لیے اس درگاہ تک چل کر آتی ہے۔۔۔۔۔؟ وہ گل رخ تو خود کسی منت کی طرح تھی تو وہ کیسا ہوگا جس کے لیے یہ منت خود اپنے گھٹنے ٹیکے اس درگاہ کی سنگ مرمر کی جالی سے جہیں زخمی کرنے ہر ہفتے چلی آتی ہے؟ وہ کون ہو سکتا ہے جس کا پتھر دل اس موم کی لڑکی کی کھچلی حالت دیکھ کر بھی نہیں پگھلتا۔ میں انہی سوچوں میں گم تھا کہ اوپر سے ایک زائر نے آ کر عبداللہ کا پیغام دیا کہ اوپر سلطان بابا آئے ہوئے ہیں اور میرا پوچھ رہے ہیں۔ لہذا میں بھی دھیرے دھیرے سیڑھیاں چڑھتا ہوا درگاہ کے صحن میں داخل ہو گیا۔ دھوپ ڈھلنے والی تھی اور درگاہ کے صحن میں سائے لمبے ہو رہے تھے۔ ایسے ہی ایک سائے میں سلطان بابا، عبداللہ اور حاکم بابا۔ مریدوں کے جھرمٹ میں بیٹھے نظر آئے۔ زہرا بھی خواتین والی بھیڑ میں سامنے بیٹھی نظر آئی۔ سبھی عورتوں نے سخت پردے کا اہتمام کر رکھا تھا۔ عبداللہ نے مجھے ہاتھ کے اشارے سے قریب آنے کو کہا اور میں بھی مریدوں کے گروہ میں ایک طرف ہو کر بیٹھ گیا۔ سلطان بابا کوئی درس دے رہے تھے اور ان کی بارعب آواز سارے صحن میں گونج رہی تھی۔ ”ڈارون کی تھیوری کہتی ہے کہ انسان کا ارتقا پہلے ہوا اور وہ بھی ایک طویل جدوجہد کے بعد۔۔۔۔۔ اور جب انسان کی موجودہ ہیئت میں اس کی کمرسیدھی ہوئی اور ہاتھوں اور پیروں نے اپنی موجودہ ساخت اختیار کی تو پھر دھیرے دھیرے مذہب کا ارتقا شروع ہوا۔۔۔۔۔ ہم مسلمان حضرت آدم و حوا کی صورت میں اس عقیدے کے قائل ہیں کہ انسان کا وجود ہی مذہب کی وجہ سے ہے اور وہ مذہب کے لیے اس کائنات میں ظہور پذیر ہوا تھا۔ گویا مذہب انسان کی آمد سے قبل بھی کائنات میں رائج تھا اور جن اور فرشتے اپنی عبادت کے ذریعے اس مذہب کی تعمیل میں مشغول رہتے تھے۔“

درو دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو  
ورنہ اطاعت کے لیے کچھ کم نہ تھے کردیاں“



میں بہت غور سے سلطان بابا کی باتیں سنتا رہا، جس خوب صورتی سے انہوں نے ڈارون کے نظریے اور مذہب کی آمد کے بارے میں دلائل دیئے تھے، وہ ان کے وسیع مطالعے کا بھی مظہر تھی۔ میں جب سے اس درگاہ میں آ جا رہا تھا، عبداللہ اور سلطان بابا جیسے نہ جانے کتنے ”پراسرار بندوں“ سے اب تک میرا سامنا ہو چکا تھا جو بظاہر سیدھے سادے لیکن اندر سے کسی سمندر سے بھی زیادہ عمیق اور گہرے تھے۔ کچھ ہی دیر میں سوال جواب کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ بھیر میں سے ایک ماڈرن وضع کا لیکن بہت جوشیلا نوجوان اٹھا اور اس نے پہلا سوال داغ دیا۔ ”حضرت آپ کی باتیں اپنی جگہ بجا لیکن ہمارے مذہب میں تو شرک کو گناہ عظیم سے بھی عظیم تر گردانا گیا ہے تو پھر کیا آپ نہیں سمجھتے کہ اس طرح ان درگاہوں پر آ کر منتیں مانگنا اور چادریں چڑھانا بھی اسی شرک کے زمرے میں آتا ہے؟“ ”ٹھیک کہا تم نے..... جو لوگ یہاں اس نیت سے آتے ہیں کہ یہاں قبر میں سویا بزرگ ہی ان کا مشکل کشا ہے اور وہی ان کی داورسی کرے گا تو وہ واقعی اس گناہ عظیم کے مرتکب ہو رہے ہیں جسے ”شرک“ کہا جاتا ہے۔ خدا انہیں اس گناہ کبیرہ سے بچنے کی توفیق عطا کرے۔ ہاں البتہ جو لوگ اس آس پر یہاں آ کر گڑگڑاتے ہیں کہ وہ اللہ کے ایک عاجز بندے کے آستانے پر اس امید پر آئے ہیں کہ اللہ کا یہ نیک بندہ، جو اس قبر میں آنکھیں بند کئے پڑا ہے، شاید اسی کے وسیلے اور سفارش سے اللہ ان کی بھی سن لے گا اور ان کی حاجت روا ہوگی تو ایسی حاضری میں کوئی حرج نہیں ہے۔ کیوں کہ بہر حال میرا تمہارا، اس درگاہ میں دفن اس نیک بندے کا اور ہم سب کا مالک ایک ہی ہے میرا اللہ.....“

نوجوان کے منہ ہوئے چہرے پر اطمینان کے آثار پیدا ہو گئے اور اس کی آنکھوں کی تختی یکا یک سلطان بابا کے لیے عقیدت میں بدل گئی۔ پھر کچھ اور معمول کے سوال کئے گئے اور اس سے پہلے کہ سلطان بابا دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتے، عورتوں کی بھیر میں سے زہرا کی خادمہ نے ہلکے سے سلطان بابا کے خاص مرید کے کان میں کچھ کہا۔ مرید نے اٹھ کر سلطان بابا سے عرض کیا۔ ”اللہ کی ایک بندی آپ سے اپنے لیے خاص دعا کی متمنی ہے۔“ سلطان بابا کے بلیج چہرے پر پھر سے ایک مبہم سی مسکراہٹ ابھری اور انہوں نے غور سے خادمہ کی جانب دیکھ کر کہا۔ ”میری دعاؤں میں اثر ہوا تو ضرور قبول ہوں گی۔ بہر حال ایک بات ابھی سے جان لینا بہت ضروری ہے، یاد رہے کہ کسی کو پالینا کبھی کبھی اس کو کھودینے سے بڑا غم ہوتا ہے..... دوسرے لفظوں میں یوں سمجھ لو کہ وصل، جدائی سے بڑا المیہ ہے۔“ میں نے چونک کر سلطان بابا کی طرف دیکھا۔ کتنی بڑی بات کہہ ڈالی تھی انہوں نے اور کہیں ان کا اشارہ میری جانب ہی تو نہیں تھا۔ اسی لمحے سلطان بابا نے بھی پلٹ کر میری جانب دیکھا۔ میں نے گھبرا کر نظریں جھکا لیں۔ وہ مجھ سے بولے ”ساحرمیاں.....! شاید تم کچھ کہنا چاہتے ہو؟“

تو گویا میرا نام بھی انہیں زبانی یاد تھا۔ میں نے ان کی جانب براہ راست دیکھنے سے حسب معمول گریز کیا۔ مجھے حیرت بھی ہوئی کہ انہیں میرے اندر کی بات کا علم کیسے ہو گیا۔ ”جی..... یونہی..... اچانک دل میں کچھ خیال آ گیا تھا، آپ کی اجازت ہو تو عرض کروں؟“ سلطان بابا نے سر ہلایا۔ ”بسم اللہ.....!“ میں نے دور بیٹھی زہرا کی جانب دیکھا، وہ سر پر چادر ڈالے جھکے سر بیٹھی تھی۔ میں نے سینے کا غبار باہر نکالنے کا فیصلہ کر لیا تھا، کلام کسی اور کا تھا لیکن معنی میرے تھے۔

اک تازہ حکایت ہے  
 سن لو تو عنایت ہے  
 اک شخص کو دیکھا تھا  
 تاروں کی طرح ہم نے  
 اک شخص کو چاہا تھا  
 اپنوں کی طرح ہم نے  
 اک شخص کو سمجھا تھا  
 پھولوں کی طرح ہم نے  
 کچھ تم سے ملتا تھا  
 باتوں میں، شاہت میں  
 ہاں تم سا ہی لگتا تھا  
 شوخی میں، شرارت میں  
 دکھتا بھی تھی سا تھا  
 دستور وہ شخص، ہمیں محبت میں  
 غیروں کی طرح بھولا  
 تاروں کی طرح ڈوبا  
 پھولوں کی طرح ٹوٹا  
 پھر ہاتھ نہ آیا وہ  
 ہم نے تو بہت ڈھونڈا  
 تم کس لیے چوٹے ہو  
 کب ذکر تمہارا ہے؟  
 کب تم سے تقاضا ہے؟  
 کب تم سے شکایت ہے؟  
 اک تازہ حکایت ہے  
 سن لو تو عنایت ہے

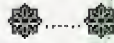


میں ایک جذب کے عالم میں نہ جانے کیا کچھ کہتا گیا۔ جب ہوش آیا تو ماحول پر سناٹا طاری تھا۔ زہرا اسی طرح سر جھکائے بیٹھی ہوئی تھی اور باقی سارے مرید بھی خاموش تھے۔ پھر سلطان بابا کی ہلکی سی کھکارنے ہی اس سکوت کو توڑا اور انہوں نے دھیرے سے زیر لب ”سبحان اللہ“ بھی کہا اور پھر محفل برخاست ہونے سے پہلے حتمی دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے۔ باقی لوگوں نے بھی ان کی تقلید کی اور مختصر سی دعا کے بعد سارا مجمع منتشر ہو گیا۔ وہ خوش ادا بھی اپنی تمام تر نزاکت کے ساتھ سلطان بابا سے دعائیں لیتی ہوئی قدم بڑھا گئی۔ ایک لمحے کے لیے تو میزادل جیسے کٹ سا گیا۔ من میں آیا کہ دوڑ کر ایک بار پھر اس کی راہ کی دھول بن جاؤں اور اس سے درخواست کروں کہ مجھے اپنے انہی نازک قدموں تلے روند کر برہاد کر ڈالے لیکن میں کچھ بھی نہ کر سکا۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہی میں نے خود ہی اس سے اپنے جنوں کے سامنے بند باندھنے کا وعدہ کیا تھا۔ کچھ ہی دیر میں درگاہ کا صحن تقریباً خالی ہو گیا۔ میں بھی ایک بارے ہوئے جواری کی طرح وہاں سے اٹھا اور عبداللہ سے اجازت لے کر واپسی کے لیے پلٹ کر چل دیا۔

اچانک پیچھے سے ایک آواز ابھری۔

کھلتا کسی پہ کیوں، میرے دل کا معاملہ  
شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

میں چونک کر مڑا۔ درگاہ کے صحن کے عین وسط میں سلطان بابا اپنی وہی دل موہ لینے والی مسکراہٹ لیے کھڑے تھے۔ ”ساحر میاں.....! واپس چل دیئے.....؟ تم سے ایک ضروری کام تھا مجھے۔“ سلطان بابا کو بھلا مجھ سے کیا کام ہو سکتا ہے.....؟ میرے ذہن میں ایک ساتھ بہت سے خدشے ابھرے۔ وہ دھیرے دھیرے چلتے ہوئے میری جانب ہی چلے آ رہے تھے۔ میں اپنی جگہ پر جیسے جم سا گیا۔



## پہلی کھوج کا خضر

میں ابھی تک اسی شش و پنج میں مبتلا تھا کہ آخرا یہی کون سی ضروری بات ہو سکتی ہے اور پھر میں بھلا سلطان بابا کے کس کام آ سکتا تھا۔ سلطان بابا نے غالباً میرا چہرہ پڑھ لیا۔ ”تم سوچتے بہت ہوسا حرمیاں..... لیکن شاید تمہیں ابھی تک سپردگی کی طمانیت کا اندازہ نہیں ہے۔“ میں نے حیرت سے ان کی جانب دیکھا۔ ”سپردگی کی طمانیت.....؟“ ”ہاں میاں..... جو سکون اور اطمینان خود کو دوسرے کے فیصلے کے سپرد کر دینے میں ہے۔ وہ بھلا اپنی جدوجہد اور کوشش میں کہاں..... بہتر یہی ہے کہ کسی کو اپنا راہبر مان لو اور پھر اسی خضر کی راہ پکڑ لو۔“ ”کاش میں بھی ان خوش نصیبوں میں شامل ہوتا، جنہیں ایسے راہبر میسر آتے ہیں، یہاں تو میری منزل ہی کا کوئی ٹھکانہ نہیں۔ ابھی تو میں اپنی راہ بھی نہیں ڈھونڈ پایا، راہ خضر تو بہت دور کی بات ہے۔“ سلطان بابا نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر غور سے میری آنکھوں میں جھانکا ”تمہارے اندر بڑی کھوج ہے اور تمہاری یہ کھوج تمہیں تمہاری اصل راہ سے زیادہ دیر تک دور نہیں رکھ پائے گی۔ میرا ایک کام کرو گے۔“ ”جی حکم کیجئے۔“ ”اگلی جمعرات یہاں درگاہ پر چند گھنٹے ڈیوٹی دے پاؤ گے۔ کچھ زیادہ سخت نہیں ہے۔ کچھ مستقل حاجت مند ہیں جو ہر غنیمت درگاہ میں حاضری دیتے ہیں، ان تک کچھ خاص ہدایات پہنچانی ہوں گی۔ کچھ نذر نیاز جو جمعرات کو یہاں جمع ہوتی ہیں اسے مستحق لوگوں میں بانٹنا ہوگا اور کچھ اور اسی نوعیت کے چھوٹے موٹے کام سرانجام دینا ہوں گے۔ اگر تمہاری اگلی جمعرات کو کوئی خاص مصروفیت نہ ہو تو۔“ ”جی ضرور میں اگلی جمعرات کو صبح سویرے حاضر ہو جاؤں گا۔“ سلطان بابا خوش ہو گئے۔ ”شاباش..... لیکن جمعرات سے پہلے کسی ایک دن آ کر عبداللہ سے ساری ہدایات اچھی طرح سمجھ لینا۔“ سلطان بابا مجھے دعا دیتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔

میں درگاہ کے دروازے سے باہر نکلا تو سیڑھیوں سے نیچے اپنی کار کے قریب یعنی کو کھڑا دیکھ کر ٹپٹا سا گیا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کی جانب بڑھے اور ہمارا سنگم درگاہ کی سیڑھیوں کے وسط میں ہوا۔ یعنی کچھ دیر تک چپ چاپ میری اتر حالت، بڑھی ہوئی شہد اور ٹھکنوں بھر الباس دیکھتی رہی۔ ”میں جانتی تھی تم مجھے یہیں ملو گے۔“ میں نے اس کا دھیان ہٹانے کے لیے مسکرا کر اسے لچھڑا، ”اور میں جانتا تھا کہ تم مجھے ضرور ڈھونڈ لو گی۔“ لیکن عینی کے چہرے کا کرب کم نہیں ہوا۔ ”ڈھونڈ ہی تو نہیں پائی تمہیں..... بس ہر لمحہ کھوتی ہی گئی..... اور آخر کار تمہیں مکمل کھوی دیا۔“ ”لیکن میں تمہیں ان لوگوں میں نہیں سمجھتا یعنی..... جو محبت کو بھی صرف سودو زیاں ہی کا سودا سمجھتے ہیں..... کبھی کبھی تو یہ درد بھی بن مانگے نہیں ملتا..... کبھی فرصت ملے تو پیچھ کر سوچنا کہ ہماری دوستی میں تم نے کیا صرف کھوایا ہے.....؟“ ”یعنی نے ایک لمبا سا سانس لیا۔“ ”ادھوری خوشی کبھی کبھی مکمل غم سے بھی زیادہ اذیت ناک ہوتی ہے ساحر..... بہر حال تمہاری زبان سے ایسی باتیں سن کر اچھا لگا..... شاید یہ بھی اس ہستی کی دین ہے..... میں اس کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے مر رہی ہوں، ضرور وہ کوئی پری زاد ہوگی جس کے لیے تم جیسے شخص نے بھی زمانے سے جوگ لے لیا ہے..... مجھے کب ملوؤ گے اس سے.....؟“ ”ضرور ملوؤں گا..... پہلے وہ مجھے تو شرف قبولیت بخش دے۔“ ”لیکن شاید تب تک بہت دیر ہو جائے ساحر..... میں نے کینیڈا کا اے۔کارل شپ



حاصل کر لیا ہے۔ اگلے ہفتے میری روانگی ہے۔ میں اس ماحول، ان یادوں اور خود اپنے آپ سے کچھ عرصے کے لیے فرار چاہتی ہوں۔“ یعنی بولتے بولتے سسک پڑی۔ مجھ سے بھی کچھ نہ بولا گیا۔ یہ محبت بھی کتنا عجیب جذبہ ہوتا ہے لوگ خوشی پانے کے لیے اس جذبے پر اپنے دل کے دروا کرتے ہیں اور پھر ساری زندگی روتے ہی رہتے ہیں۔ یعنی پھر وہاں زیادہ دیر رک نہیں پائی اور مجھ سے رخصت ہو کر پلٹ گئی۔ میں اس کے جانے کے بعد بھی بہت دیر تک وہیں ساحل پر بیٹھ کر سورج کے ڈوبنے کا نظارہ کرتا رہا۔ یہ سورج کتنا خوش تھا۔ ہر روز ڈوبنے کے بعد اگلی صبح اسے نئی زندگی مل جاتی تھی لیکن میری قسمت کا تار اتو کچھ ایسا ڈوبا تھا کہ اب اس کے دوبارہ ابھرنے کا کوئی امکان نہ تھا۔

میں رات دیر گئے گھر پہنچا تو ڈاکٹریز دانی کی گاڑی کو باہر نکلتے دیکھ کر ایک دم ہی پریشان ہو گیا۔ ماما کو سخت بخار تھا۔ پچھلے کئی ہفتوں سے وہ میری وجہ سے جس شدید ذہنی دباؤ کا شکار تھیں، اس کا نتیجہ کچھ تو نکلتا ہی تھا۔ اس رات میں اور پاپا سونے تک ان کے سر ہانے ہی بیٹھے رہے اور مجھے ماما سے بہت سے جھوٹے وعدے بھی کرنے پڑے۔ یہ مائیں بھی کتنی بھولی ہوتی ہیں، اچھی طرح جانتی ہیں کہ ان کے بچہ کا کلر ان کا دل، بھلانے کے لیے ان کی ہر بات پہ ”ہاں“ کہتا چلا جا رہا ہے لیکن پھر بھی اس کی ہر ”ہاں“ پر ان کا دل، ان کے چہرے کی طرح کھلا جاتا ہے۔

ماما کے سونے کے بعد پاپا میرے ساتھ ہی میز پر چلے آئے۔ میں جانتا تھا کہ ان کے دل و دماغ میں اس وقت کیسی آندھیاں چل رہی ہوں گی، لیکن حسب معمول ان کے چہرے پر وہی مہربان سا سکوت طاری تھا، جیسے کوئی گہرا سمندر، جو اپنی ت میں جانے کتنے طوفان اور کتنے مہنور چھپائے ہوئے ہوتا ہے لیکن اپنی سطح پر اپنے اندر ہونے والی تبدیلیوں کا پتا آخر وقت تک نہیں چلنے دیتا۔ انہوں نے مسکرا کر مجھ سے پوچھا۔ ”ہاں بیک مین..... تمہاری جنگ کیسی جا رہی ہے؟ اس پتھر دل پر کچھ اثر ہوا کہ نہیں.....؟“ میں بھی ان کا سوال سن کر مسکرا دیا۔ ”کچھ جنگیں دنوں میں نہیں..... جنموں میں جیتی جاتی ہیں پاپا..... لیکن اس بات کا اطمینان ضرور رکھئے کہ آخری جیت آپ کے سپوت ہی کی ہوگی.....“ میں جانتا ہوں..... میرے بیٹے نے ہارنا نہیں سیکھا..... لیکن جانے کیوں اس بار مجھے شکست سے بہت زیادہ ڈر لگ رہا ہے.....“ میں نے چونک کر پاپا کی جانب دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں کسی ان دیکھے خوف کی پرچھائیاں لرزاں تھیں۔ ”میں بہت شرمندہ ہوں پاپا..... شاید میں آپ کے خوابوں کی تعبیر ثابت نہیں ہو سکا..... آپ کے کسی کام نہیں آ سکا..... آپ بھی کیا سوچتے ہوں گے کہ.....“

پاپا نے جلدی سے میری بات کاٹ دی۔ ”نہیں..... بالکل نہیں..... میں، یا تمہاری ماما یا کچھ بھی نہیں سوچتے..... اولاد ہمیشہ ماما باپ کے خوابوں کی بھینٹ چڑھنے کے لیے ہی تو نہیں ہوتی..... ہم تو بس تمہیں خوش دیکھنا چاہتے ہیں۔ پھر چاہے تمہاری خوشی کہیں بھی ہو.....“ بولتے بولتے پاپا کی آنکھیں بھر آئیں۔ اس لمحے مجھے ان پر بے حد پیار آیا اور میں نے بڑھ کر انہیں زور سے گلے لگا لیا۔ خود میری آواز بھی بھر اسی گئی۔ ”پاپا..... میں کیا کروں..... مجھے اس کے علاوہ اب اور کچھ سوچتا ہی نہیں..... کوئی اور لہجہ اتنا ہی نہیں..... میں اتنا بے بس تو کبھی بھی نہیں تھا..... لیکن میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ میں اس بھیڑ میں شامل نہیں ہوں گا، جو اس راہ پر ناکامی کے بعد بھٹک کر کہیں کھو جاتی ہے..... میں ان اندھیروں میں اپنی روح کو کبھی ہٹکنے نہیں دوں گا۔“ میں جانتا ہوں..... اور مجھے تم پر پورا اعتبار ہے..... ہم تقدیر کو کتنی آسانی سے اپنی ناکامیوں اور زندگی کی تلخیوں کا الزام دیتے رہتے ہیں لیکن کبھی تقدیر سے ان نعمتوں کی وجہ سے پیار نہیں کرتے جو اس نے ہماری زندگی میں قدم قدم پر فراہم کر رکھی ہوتی ہیں۔

میرے ماں باپ بھی تو قدرت کی ایک ایسی ہی نعمت تھے، جن کے بدلے قدرت کا ہر قسم گوارا تھا۔ مجھے اگر ماں باپ کا اتنا پیار، اتنا حوصلہ نہ ملا ہوتا تو زہرا کی بے رخی شاید بہت پہلے مجھے توڑ چکی ہوتی۔

اگلے دن میں نے درگاہ جا کر عبداللہ کو سلطان بابا کی دی ہوئی ڈیوٹی کے بارے میں بتایا اور اس سے جمعرات کے معمولات کی تفصیل بھی معلوم کی۔ مجھے صبح سویرے درگاہ پہنچنا تھا اور معمول کے چند کام مثلاً درگاہ کے زائرین کے لیے پانی بھرنا، پودوں کو پانی اور پرندوں کو دانہ وغیرہ ڈالنا، جمعرات کے لنگر کے باورچیوں سے اپنی نگرانی میں کھانا، خوانا وغیرہ اور ایسے بہت سے دیگر چھوٹے چھوٹے کام سرانجام دینا تھے۔ لیکن عبداللہ نے سب سے اہم ذمہ داری کا ذکر سب سے آخر میں کیا۔ عصر کی نماز کے بعد درگاہ پر آنے والے زائرین کے نذرانے عبداللہ اپنے حجرے میں وصول کرتا تھا۔ مرد دروازے سے اندر آ کر اور عورتیں لکڑی کی جالی والی کھڑی کے پیچھے سے اپنے نذرانے جمع کرواتی تھیں، جنہیں اسی وقت مستحقین میں بانٹ دیا جاتا تھا۔ اس جمعرات کی شام مجھے یہ تمام نذرانے وصول کرنے تھے۔ نقدی کی فہرست بنانا تھی اور باقی تحائف کو الگ کر کے عبداللہ کی دی ہوئی فہرست کے مطابق تقسیم کرنا تھا۔ کچھ مستحقین تو خود اپنا حصہ وصول کرنے درگاہ کے احاطے میں جمع ہو جاتے تھے اور کچھ لوگوں کو بذریعہ ڈاک ان کا حصہ بھیجا ہوتا تھا۔ مجھے اس بات پر شدید حیرت بھی ہوئی کہ اس فہرست میں چند لوگوں کی تنخواہ کا ذکر بھی تھا۔ یا میرے خدا..... یہ کیا نظام تھا۔ یہ کون لوگ تھے جن کی تنخواہ ایک اجنبی ہاتھ اور ایک انجانے منتظم کے تحت بنی تھی۔ دولت کی تقسیم کا یہ کیا نظام تھا.....؟

آخر کار جمعرات کا دن بھی آ پہنچا۔ میں صبح سویرے ہی بنا کسی کو بتائے اپنی گاڑی میں درگاہ آ گیا تھا۔ عبداللہ اور سلطان بابا مجھ سے بھی پہلے اپنے سفر پر نکل چکے تھے۔ جاتے جاتے بھی عبداللہ میرے لیے پورا ہدایت نامہ لکھ گیا تھا۔ میں نے معمول کے تمام کام سہ پہر ہونے سے پہلے ہی بنیاد دیے۔ میں کئی ہفتوں سے اس درگاہ میں آ رہا تھا لیکن آج تک میں نے کبھی عبداللہ کا حجرہ اندر سے نہیں دیکھا تھا۔ ایک تو وہ چھوٹا سا حجرہ درگاہ کے مرکزی صحن سے بہت ہٹ کر تھا اور دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ عبداللہ سے میری ملاقات عموماً باہر ہی ہو جاتی تھی۔ لیکن آج چونکہ مجھے عصر کے وقت سے اسی حجرے میں نذرانہ وصول کرنی تھی لہذا میں نے سوچا کہ کچھ دیر پہلے ہی درگاہ کے برآمدے میں بنی لکڑی کی جالیوں سے پرے اس حجرے کو ایک نظر دیکھ ہی آؤں اور پھر ایک عجیب سی بات ہوئی جیسے ہی میں برآمدے میں بنی جالیوں کو پار کر کے حجرے کے دروازے کے قریب پہنچا تو یکایک میرے ذہن میں ایک ساتھ بہت سے جھماکے ہوئے اور اچانک ہی یہ اجنبی ماحول مجھے کچھ مانوس سا محسوس ہونے لگا اور پھر جیسے ہی میں نے حجرے کا دروازہ کھولا تو لمبے کے ہزاروں حصے سے بھی شاید کچھ پہلے مجھے اچانک ہی یوں محسوس ہوا جیسے میں اس حجرے میں پہلے بھی کبھی آ چکا ہوں، پھر تو ذہن میں جلتی بجھتی روشنیاں کچھ اتنی تیزی سے لپکنے لگیں کہ چند لمبے کے لیے تو میں سن ہو کر ہی رہ گیا۔ سب مجھے یاد آنے لگا کہ میری ایسی حالت تو اس دن بھی ہوئی تھی، جب میں نے پہلی مرتبہ درگاہ کے صحن میں قدم رکھا تھا۔ جب میری پہلی نظر عبداللہ پر پڑی تھی اور جب پہلی مرتبہ سلطان بابا نے مجھے درگاہ کے دروازے پر کھڑا دیکھا تھا..... ہر دفعہ مجھے کچھ یوں ہی محسوس ہوا تھا جیسے میرے ساتھ یہ واقعہ پہلے بھی پیش آ چکا ہے، لیکن ہر بار میں نے اپنے ذہن کو جھٹک کر خود کو یہ تسلی دے دی تھی کہ ایسا تو کم و بیش ہر انسان کے ساتھ ہوتا ہے۔ جب اسے کوئی واقعہ، کوئی بات اور کوئی جگہ، یا کوئی شخصیت پہلی مرتبہ ملنے، یاد دیکھنے کے باوجود جانی پہچانی لگتی ہے بلکہ بعض مرتبہ تو ہمارے ساتھ یہ بھی ہوتا ہے کہ ہم کسی کے منہ سے نکلنے والی بات بھی



چند لمحے پہلے جان لیتے ہیں۔ مجھے تو یہ تحت الشعور اور لاشعور کا کوئی معمول کا کھیل لگتا ہے، لہذا میں نے حسب معمول ان باتوں پر دھیان دینا بھی گوارا نہیں کیا تھا۔ لیکن عبداللہ کے حجرے میں داخل ہوتے ہی وہ انجانا احساس اس شدت سے مجھ پر حملہ آور ہوا کہ میں کچھ دیر کے لیے اپنے حواس ہی میں نہ رہ سکا۔ لیکن جتنی تیزی اور شدت سے مجھ پر اس کیفیت کا غلبہ ہوا تھا، اتنی ہی جلدی وہ جھماکا ختم بھی ہو گیا، جیسے بارود کا کوئی ڈھیر جو ایک ہی چنگاری سے لحوں میں بھسم ہو جائے..... کچھ دیر تو میں بالکل خالی لا ذہن سا کھڑا حجرے کی دیواروں کو تکتا رہا۔ یہ ایک چھوٹا سا کمرہ تھا، جس میں ایک جانب ایک نیچے لکڑی کی کھڑکی بنی ہوئی تھی، جو باہر برآمدے کی جانب کھلتی تھی۔ کھڑکی پر بانس کے موٹے ٹکڑوں والی چمک پڑی ہوئی تھی۔ غالباً یہ وہی کھڑکی تھی جو خواتین کی نذر کے لیے مخصوص تھی، تبھی پردے کا ایسا خاص اہتمام کیا گیا تھا۔ کمرہ صاف ستھرا تھا اور ایک جانب چند دینی اور کچھ معلوماتی کتب لکڑی کے ایک شیلف پر سلیقے سے رکھی ہوئی تھیں۔ پانی کی صراحی اور چھت سے لگے ہوئے مورچھل (ہاتھ سے چلنے والے پنگے) کے علاوہ حجرے میں مزید کوئی سامان نہ تھا۔ کمرہ کمانے کے لیے زمینی درے کے اوپر دیوار کے قریب ایک تکیہ بھی پڑا ہوا تھا۔ میں نے جیب سے عبداللہ کی دی ہوئی فہرست کو نکالا اور ایک بار پھر غور سے تمام ہدایات کو دہرایا۔

کچھ ہی دیر میں زائرین کی آمد شروع ہو گئی اور میں ان کے دیئے ہوئے نذرانوں کی فہرست بنانے میں مشغول ہو گیا۔ ذرا سی دیر میں اچھی خاصی رقم بھی جمع ہو گئی تھی۔ پھر مردوں کا جہوم چھنا تو کھڑکی کے قریب سے عورتوں کی بھانت بھانت کی بولیاں شروع ہو گئیں۔ کسی کو اولاد نہ ہونے کا غم تھا تو کوئی ناخلف اولاد سے منتظر تھی، کسی کو بیٹے کی شادی کی جلدی تھی تو کوئی ارمانوں سے لائی گئی بہو کے ہاتھوں نالاں تھی۔ کوئی بیماری کی وجہ سے پریشان تھی تو کوئی پریشانی کی وجہ سے۔ عبداللہ کی ہدایت کے مطابق لکڑی کی چمک کی چلمن کی دوسری جانب سے انہیں صرف ہوں ہاں میں جواب دیتا جا رہا تھا اور غالباً عورتیں اب تک مجھے عبداللہ ہی سمجھ رہی تھیں۔ عورت اپنا نام بتاتی، اپنی نذر کھڑکی سے اندر بڑھاتی اور میں عبداللہ کی دی ہوئی فہرست کے حساب سے اس عورت کا نام پڑھ کر اسے ہدایت، یاد دہانی کرنے کی تدبیر بتاتا جاتا۔ میرے لیے یہ بالکل نیا اور انوکھا تجربہ تھا۔ بظاہر اوپر سے ہنسی کھیلتی اور خوش حال دنیا تو اندر سے بے حد زخمی اور بہت دکھی تھی اور حیرت کی بات یہ تھی کہ سبھی کے دکھ تقریباً ایک ہی جیسے تھے۔ میں خواتین کو ہدایات جاری کرتے ہوئے ہی کچھ چھپتی ہوئی سوچوں میں کھویا ہوا تھا کہ یکا یک کھڑکی کے قریب سے ایک ملائم سی آواز ابھری۔ ”آداب.....“ دفعۃً وہی ٹھنڈی سی پروائی چلی اور میرا سانس میرے سینے میں اٹک سا گیا۔ میری زبان گنگ ہو گئی اور میرے سارے لفظ ایک لمحے میں ہی کہیں کھو گئے۔ وہ دھیرے سے دوبارہ کھنکھاری۔ میرے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑنے لگے۔ ہاں..... یہ تو وہی تھی۔ میں نے جلدی سے عبداللہ کی دی ہوئی فہرست پر نظر ڈالی لیکن اس میں مجھے زہرا کا نام، یا اس کے لیے کوئی بھی ہدایت لکھی ہوئی دکھائی نہ دی۔ میں نے چلمن سے ذرا سا باہر جھانک کر دیکھا۔ ہاں..... وہی تو تھی صرف ایک دیوار کے فاصلے پر، مجھ سے اتنا قریب کہ میں اس کی سانس لینے کی مدہم آواز بھی سن سکتا تھا۔ ایک لمحے کو میرا جی چاہا کہ میں وہاں سے اٹھ کر بھاگ جاؤں لیکن میرے قدموں نے تو میرے جسم کا بوجھ بھی سہارنے سے انکار کر دیا تھا، بھاگ کر کہاں جاتا؟ زہرا بھی دوسری عورتوں کی طرح یہی سمجھ رہی تھی کہ کھڑکی کے پار عبداللہ بیٹھا ہوا ہے۔ وہ چند لمحوں تک جواب کا انتظار کرتی رہی اور پھر دھیرے سے اپنی جھرنوں جیسی گنگنائی آواز میں بولی۔ ”ہماری نیاز قبول فرمائیں۔“ میں نے چونک کر دیکھا تو اس کا مخرو طلی ہاتھ چلمن سے اندر جھانک رہا تھا۔ میں نے

گھبرا کر اس کے ہاتھ میں پکڑا خط کے لفافے جیسا چھوٹا سا لفافہ لے لیا۔ شاید لفافے میں کرنسی نوٹ تھے۔ میری زبان سے صرف ایک لفظ ہی نکل پایا۔ ”شکریہ.....“ دوسری جانب سے اس کی دل میں سیدھا تر جانے والی آواز ابھری ”میں آج بھی اپنے سوال کے جواب کا انتظار کر رہی ہوں.....“ یا خدا..... یہ کس سوال کی بات کر رہی تھی.....؟..... اب میں اسے کیا جواب دوں..... عبداللہ سے اتنی بڑی غلطی کیسے ہو گئی۔ باقی سب کے بارے میں تو اس نے اتنی تفصیل سے مجھے بتا دیا تھا، پھر زہرا کے بارے میں بتانا کیسے بھول گیا وہ.....؟ مجھے اور تو کچھ سوچنا نہیں بس ہلکے سے کھانسی کر میں نے اپنے ہر تن گوش ہونے کا پیغام اس تک پہنچانے کی کوشش کی۔ اس بار مجھے زہرا کی آواز کچھ بھرائی ہوئی سی محسوس ہوئی، جیسے وہ بے حد کرب میں بول رہی ہو۔ ”میں جانتی ہوں..... آپ کے پاس میرے کسی سوال کا کوئی جواب نہیں..... میں آج بھی ہمیشہ کی طرح یہاں سے ناکام اور نامراد ہی واپس پلٹوں گی..... اگر آپ کی چپ ہی میرا مقدر ہے تو مجھے یہ خاموشی بھی قبول ہے..... لیکن ایک بات تو آپ بھی اچھی طرح جانتے ہیں..... میں عمر بھر آپ کی اس چوکھٹ پر اپنا سر بٹختی رہوں گی لیکن کسی اور کے خیال کو اپنے من کے قریب بھی نہیں پھٹکنے دوں گی۔ آپ سے محبت کی اگر یہی سزا ہے تو میں اسے بھی اپنے لیے جزا ہی سمجھوں گی.....“ میرے دل و دماغ میں جیسے جھکڑ چل رہے تھے اور سارا کمرالک ساری دنیا ہی مجھے گھومتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ تو گویا اس زہرا جیوں کے دل میں کوئی اور نہیں بلکہ خود عبداللہ ہی بسا ہوا تھا۔ اتنا بڑا دھوکا، ایسا عظیم فریب تو کسی جانی دشمن نے بھی نہ دیا ہوگا کسی کو..... پھر عبداللہ نے میرے ساتھ ایسا کیوں کیا؟؟؟

زہرا جانے کب اٹھ کر جا چکی تھی۔ حسد، جلن اور کرب کے طوفان نے میری آنکھوں میں مرجیں سی بھردی تھیں۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں اتنی زور سے چلاؤں کہ یہ ساری کائنات ہی پھٹ کر ریزہ ریزہ ہو جائے۔ میں نے ہاتھ میں پکڑے ہوئے اس لفافے پر نظر ڈالی جو ابھی کچھ دیر پہلے زہرا نے مجھے تھما یا تھا۔ بہت سے بڑے کرنسی نوٹوں کے درمیان ایک چھوٹی سی پرچی لفافے سے باہر جھانک رہی تھی۔ میں نے بے دھیانی میں پرچی باہر نکالی اور اپنی سلگتی ہوئی نظریں اس ستم گر کی شستہ تحریر پر گاڑ دیں۔ پرچی پر صرف ایک شعر لکھا ہوا تھا۔

میرے جسم بوسیدہ میں ذرا جو جان باقی ہے  
کسی کے لوٹ آنے کا کوئی امکان باقی ہے  
وہ چاہے راستہ بدلے، چاہے رابطہ بدلے  
اسے مجھ سے محبت ہے، میرا ایمان باقی ہے

مجھے یوں لگا جیسے وہ لفظ نہیں، چھوٹے چھوٹے سے سنبولے ہیں۔ میں نے گھبرا کر پرچی وہیں پھینک دی اور تیزی سے دوڑتا ہوا حجرے سے باہر نکل گیا۔





## دورِ جنوں

جب مجھے ہوش آیا تو میں اپنے ہی گھر میں بستر پر پسینے میں شرابور پڑا تھا۔ مماء پپا اور ڈاکٹر یزدانی سمیت چند ڈاکٹروں کی ٹیم میرے سر ہانے کھڑی تھی۔ میں نے گھبرا کر اٹھنا چاہا تو ممانے جلدی سے مجھے کاندھوں سے پکڑ کر زبردستی لٹا دیا۔ ”لیٹے رہو میری جان..... پورے چھتیس گھنٹے کے بعد تمہیں مکمل ہوش آیا ہے۔ اب اگر تم نے بستر چھوڑا تو میں تم سے کبھی نہیں بولوں گی۔“ ۳۶ گھنٹے..... یا میرے خدا..... ابھی چند لمحے پہلے ہی تو میں درگاہ سے اپنی بیٹیگی اور جلتی ہوئی آنکھیں لے کر دوڑتا ہوا بابا ہر نکلا تھا۔ میرا ارادہ زہرا کو روکنے کا تھا لیکن اس کی گاڑی میرے باہر نکلنے سے پہلے ہی وہاں سے روانہ ہو چکی تھی۔ مجھے یاد نہیں کہ میں نے کس طرح اپنی گاڑی اشارت کی تھی اور میں کب اور کیسے اپنے گھر کے پورچ تک پہنچا تھا۔ بعد میں ممانے بتایا کہ میں گاڑی سے نکلنے ہی لہرا کر وہیں پورچ میں ہی گر پڑا تھا اور تب سے لے کر اب تک میرے بے ہوشی کے وقفے گھرے ہی ہوتے گئے تھے۔ گویا آج ہفتے کا دن تھا اور میں جمہرات کو درگاہ سے نکلا تھا۔ کبھی کبھی انسان کی زندگی سے وقت کے قیمتی لمحے کچھ اس طرح سے بھی چوری ہو جاتے ہیں کہ وہ بس شیشا تابی رہ جاتا ہے۔ میرے ساتھ بھی اس وقت کچھ ایسا ہی معاملہ تھا اور پھر اگلے تین چار دن تک ممانے میری کچھ ایسی سختی سے نگرانی کی کہ میں واقعی بستر سے قدم تک نیچے نہ دھر سکا۔ لیکن میری رگوں میں جو انگارے بھر چکے تھے، میں ان کا کیا کرتا؟ مجھے ہر حال میں عبداللہ سے ملنے جانا تھا۔ میں اس دھوکے باز انسان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس سے پوچھنا چاہتا تھا کہ اگر زہرا خود اس کی محبت میں مبتلا تھی تو پھر اس نے آخر میرے ساتھ ہی چوہے ملی کا کھیل کیوں کھیلنا؟ میری پر خلوص دوستی کا مذاق کیوں اڑایا؟ اگر وہ پہلے دن مجھے یہ بات بتا دیتا تو میں زہرا کی دیوانگی میں اتنا آگے تو نہ بڑھتا۔ یہ اور اس جیسے جانے کتنے سوالات تھے جن سے میرا سر پھٹا جا رہا تھا لیکن اس بار مماء اور پاپا کا پہرہ اتنا کڑا تھا کہ ان کے علم میں لائے بنا میرا پلک جھپکنا بھی محال تھا۔ لہذا چوتھے دن مجبوراً مجھے پپا کو اعتماد میں لینا پڑا کہ میرا اگلے دن یعنی جمہرات کی شام کو درگاہ جانا بے حد ضروری ہے لیکن پپانے بھی اس مرتبہ مماء کے سامنے ہتھیار ڈال دیے تھے۔ آخر کار خوب بحث و مباحثے کے بعد وہ بمشکل اس بات پر راضی ہوئے کہ وہ مماء سے مجھے درگاہ جانے کی اجازت دلوانے کی کوشش کریں گے لیکن صرف اور صرف اس شرط پر کہ وہ بھی میرے ساتھ جائیں گے، کیوں کہ اب وہ مجھے وہاں اکیلے بھیجے کا رسک لینے پر تیار نہیں تھے۔ میرے پاس ان کی بات مان لینے کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ لیکن جب مماء کو ہم دونوں باپ بیٹے کے ارادوں کا پتا چلا تو انہوں نے آسمان ہی سر پر اٹھالیا۔ وہ پپا پر بہت ناراض ہوئیں کہ انہوں نے ہی مجھے اس حال پر پہنچایا ہے۔ آخر کار بڑی مشکل سے جنگ بندی کا اعلان ہوا لیکن تب تک یہ طے پا چکا تھا کہ پپا کے ساتھ اب مماء بھی درگاہ کے لیے ہماری ہم رکاب ہوں گی، کیوں کہ اب وہ کسی صورت بھی مجھے اپنی آنکھوں سے اوجھل نہیں کرنا چاہتی تھیں۔

اگلے دن مقررہ وقت پر ہم تینوں کو پپا کے ڈرائیور نے درگاہ کے دروازے پر پہنچا دیا۔ زائرین کی چہل پہل شروع ہو چکی تھی اور دور دراز سے

سے پرے مجھے زہرا کی گاڑی بھی کھڑی نظر آگئی۔ میں نے یہاں آنے کے لیے جمرات کے دن تک کا یہ انتظار صرف اسی لیے کیا تھا، کیونکہ میرا ارادہ زہرا کے سامنے عبداللہ سے بات کرنے کا تھا تاکہ اسے مزید کوئی بہانہ بنانے کا موقع نہ مل سکے۔ درگاہ کے صحن میں داخل ہوتے ہی میری پہلی نظر نازرین کی بھیڑ میں گھرے سلطان بابا پر پڑی۔ میں نے ماما اور پاپا کو انہیں سلام کرنے کی غرض سے اس طرف بھیج دیا اور خود عبداللہ کے حجرے کی جانب بڑھ گیا۔ مجھے یقین تھا کہ زہرا بھی حجرے کی پچھلی جانب لکڑی کی جالیوں والی چٹمن کے برآمدے ہی میں موجود ہوگی۔ میرا دل ایک دم ہی بجھ سا گیا تھا میں یہ ساری لا حاصل کوشش کیوں کر رہا تھا؟ جب وہ خود میرے نصیب ہی میں نہ تھی تو پھر وہ چاہے کسی کا بھی مقدر ہو۔ اس بات سے میری کالی قسمت کا لکھا دھل تو نہیں سکتا تھا۔ جیسے جیسے حجرے کا دروازہ قریب آتا گیا، میرے قدم بالکل ہی بے جان ہوتے گئے۔ آج اس جانب مرد حاجت مندوں کی بھیڑ بالکل ہی مفقود تھی۔ شاید میں بہت جلدی آ گیا تھا، یا پھر مجھے بہت دیر ہو گئی تھی۔ میں نے سر جھٹک کر خیالات کی یلغار روکی اور جیسے ہی حجرے کے دروازے کو ہلکا سا دھکا دیا، عبداللہ کی آواز نے میرے قدم جکڑ لئے۔ وہ دوسری جانب کھڑکی کے پار کسی سے مخاطب تھا۔ اس کی آواز میں جھنجھلاہٹ سی تھی۔ ”عورت..... عورت..... یہ کچھ الگ معاملہ ہے۔ آخر آپ سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتیں۔ یہ اختیار کا معاملہ ہے۔“ دوسری جانب سے وہ آواز ابھری، جسے میں دنیا کی کروڑوں آوازوں کے درمیان بھی پہچان سکتا تھا۔ وہ زہرا ہی تھی۔ ”بات اگر اختیار کی ہے تو پھر میں بے اختیار ہوں۔ خود پر اختیار ہوتا تو میں بار بار یہاں کیوں آتی۔ اگر آپ میرے راستے پر نہیں چل سکتے تو نہ سہی، میں تو آپ کے راستے کی دھول بن سکتی ہوں نا.....“

عبداللہ نے گہرا سانس لیا۔ ”میں شادی شدہ ہوں اور دوسری شادی کر کے میں انصاف نہیں کر پاؤں گا۔ میں اپنی بیوی اور بچے سے بہت محبت کرتا ہوں۔ کاش میں آپ کی کوئی مدد کر سکتا لیکن اپنی تقدیر میں لے کا نئے آپ نے خود پوئے ہیں۔ اب بھی وقت ہے، آپ سنبھل جائیں۔“ زہرا سسکی۔ ”کاش یہ مشورہ آپ چار سال پہلے اس وقت مجھے دیتے جب میں نے کلاس میں آپ کو پہلی بار دیکھا تھا تب تو آپ شادی شدہ بھی نہیں تھے، نہ ہی میں آپ کو ٹھیک طرح سے جانتی تھی۔ لیکن میرا تو سب کچھ جس جس کر دیا آپ کی اس پہلی نظر نے۔ آپ ہی بتائیے اس میں میرا کیا قصور ہے۔ آپ نے اپنی پہلی نظر کو روکا کیوں نہیں؟“ عبداللہ نے لمبی سی سانس لی۔ ”کسی کے مقدر میں کبھی نہ کبھی کہیں نہ کہیں وہ پہلی نظر ضرور لکھی ہوتی ہے۔ پھر یہ اگلے کا نصیب ہے کہ وہ نظر اسے گل و گلزار کر دے، یا پھر جلا کر خاکستر۔ افسوس آپ کی قسمت میں اس نظر کی شبنم کے بجائے یہ چنگاری لکھی تھی۔ لیکن اب بھی یہ آگ شبنم میں بدل سکتی ہے۔ اپنے مقدر پر قناعت کر لینا بھی بہت بڑی عبادت ہے۔ اپنی عبادت کو یوں برباد نہ کریں۔ میں آپ کا نصیب نہیں ہوں۔“ مجھے آہٹ سے یوں محسوس ہوا کہ جیسے عبداللہ نے کھڑکی سے ہٹ جانے کا ارادہ کیا تو چھٹی زہرا کی ٹوٹی ہوئی آواز سنائی دی۔ ”میں آپ سے اپنا نصیب بدل دیئے جانے کی دعا کی امید تو کر سکتی ہوں، کیا آپ میرے لیے اتنی سی دعا بھی نہیں کریں گے.....؟“ ”میری ہر دعا میں آپ ہمیشہ شامل رہیں گی۔ فی امان اللہ۔“ شاید زہرا کھڑکی سے ہٹ چکی تھی۔ میں پورا دروازہ کھول کر اندر آ گیا۔ عبداللہ نے چونک کر میری جانب دیکھا۔ آؤ ساحر میاں، اندر آ جاؤ، میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔

ہم دونوں کو اس حجرے میں خاموش بیٹھنے کا کافی دیر بیت چکی تھی۔ آخر کار میں نے ہی سکوت توڑا۔ ”سچ کہوں تو پہلے مجھے زہرا کی محبت کا راز



جان کر بہت برا لگا تھا۔ مجھے ایسا لگا جیسے تم نے مجھے بہت بڑا دھوکا دیا ہو، میری پیٹھ میں خنجر گھونپا ہو۔“ عبداللہ ہلکے سے مسکرا دیا۔ ”اور اب..... اب تمہارے خیالات کیا ہیں، اس بارے میں۔“ ”اب مجھے ایسا لگا ہے، جیسے تم بھی مجبور ہو، میری طرح، بے حد مجبور۔ میں زہرا کی محبت میں مبتلا ہوں، زہرا تمہارے عشق میں گرفتار ہے۔ تم کسی اور کی چاہت کے حصار میں ہو۔ شاید کبھی کسی کو مکمل جہاں نہیں ملتا۔ لیکن تم نے مجھ سے یہ بات کیوں چھپائی۔ اس میں کیا بھید ہے۔ یہ میں اب بھی نہیں سمجھ پایا۔“ عبداللہ نے ایک گہری سی سانس لی..... ”سب پہلے سے طے ہوتا ہے ہماری مرضی کہاں چلتی ہے۔ تمہارا اس درگاہ میں آنا، زہرا سے ملنا، محبت کے اس کانٹوں بھرے جنگل سے گزرنا، یہ سب کچھ طے ہی تو تھا، رفتہ رفتہ تمہیں سب کچھ سمجھ میں آ جائے گا۔“

عبداللہ نے کچھ ہی دیر بعد مجھے اپنی اور زہرا کی پہلی ملاقات سے لے کر اب تک کی کہانی سنادی تھی۔ عبداللہ جس یونیورسٹی سے اردو ادب میں ایم اے کر رہا تھا، زہرا بھی اسی یونیورسٹی کی طالبہ تھی۔ لیکن اس کا داخلہ چونکہ کچھ دیر سے ہوا تھا لہذا اس کے استاد نے اس کی کلاس کے ایک لڑکے یعنی عبداللہ کو اس کی مدد کے لیے مقرر کر دیا تھا۔ لیکن عبداللہ کے علم اور اس کے شائستہ اطوار نے زہرا کے دل میں کسی اور ہی جذبے کو ہوا دے دی اور وہ تنہا ہی بہتی چلی گئی۔ پھر شاید زہرا نے روایتی حجاب، یا پھر اپنے حسن کے بھرم میں اقرار کرنے میں کچھ دیر لگا دی۔ عبداللہ کو اپنے والد کی موت کی اطلاع ملتے ہی جلدی میں اپنی ڈگری کے نتیجے کا انتظار چھوڑ کر آبائی گاؤں جانا پڑا، جہاں مقدر نے اس کی راہ میں شاوی کے رشتے کی بیڑیاں گاڑ رکھی تھیں۔ پھر ٹرین سے شہر واپس آتے ہوئے ایک اسٹیشن پر اس کی سلطان بابا سے ملاقات ہو گئی اور عبداللہ کی زندگی کا دھارا ہی بدل گیا۔ عبداللہ گھر سے اپنی ایم اے کی ڈگری لے کر اپنی ہی یونیورسٹی میں لیکچررشپ کی وہ نوکری قبول کرنے کے لیے نکلا تھا جس کا انٹرویو کئی ماہ پہلے بڑی تنگ دود کے بعد اس نے پاس کیا تھا۔ لیکن قدرت نے اس کے لیے درگاہ کی یہ نوکری شاید بہت پہلے ہی سے ڈھونڈ رکھی تھی۔ قسمت کا لکھا دیکھئے کہ زہرا کے خوابوں کی کمند بھی کسی درگاہ پر آ کر ٹوٹتی تھی۔ وہ پہلے ہی عبداللہ کے یوں بننا بتائے غائب ہو جانے سے بے حال تھی۔ کسی سہیلی نے مشورہ دیا کہ اس درگاہ کے بارے میں بہت سن رکھا ہے کہ یہاں مانگی جانے والی منت کبھی رونہیں ہوتی۔ لیکن زہرا کیا جانتی تھی کہ وہ جس منت کی تلاش میں درگاہ کے پتے صحن میں پہلی مرتبہ قدم رکھ رہی ہے وہ منت خود سر جھکائے کسی اور دعا کے لیے وہاں سجدے میں پڑی ملے گی۔ عبداللہ اور زہرا کی نظریں ملیں اور زہرا کا سب کچھ ایک بار پھر ہمیشہ کے لیے لٹ گیا۔ عبداللہ کا حلیہ بالکل بدل چکا تھا۔ چہرے پر کلین شیو کی جگہ گھنی داڑھی نے لے لی تھی اور جدید تراش کے لباس کے بدلے اب وہ سادہ سفید کرتے، شلوار میں لمبوں تھا۔ ابھی زہرا اپنی پہلی حیرت کے صدمے ہی سے باہر نہیں نکلی تھی کہ اس کے سر پر دوسری قیامت بھی ٹوٹ پڑی۔ عبداللہ کی شادی کا سن کر تو وہ بالکل ہی ڈھسے گئی اور بس، وہ دن اور آج کا دن، اس نے پھر پلٹ کر زندگی کی طرف نہیں دیکھا۔ اس کی حیات کا محور تب سے یہی درگاہ اور یہی ایک منت رہ گئی تھی۔

میں حیرت سے عبداللہ کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ کتنا خوش نصیب تھا کہ جس کے لیے ایک پری خود زندگی بھر کے لیے اس کڑی اور جھلساتی دھوپ میں اپنا کوئل وجود اور رموی پر بچکھانے کو تیار بیٹھی تھی۔ میں عبداللہ کے فسانے میں اس قدر رگن ہوا کہ مجھے دقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلا۔ میں یہ بھی بھول گیا کہ میرے والدین بھی آج میرے ساتھ آئے ہوئے ہیں۔ سلطان بابا نے کسی زائر کے ہاتھ پیغام بھیجا تو میں چونکا۔ ورنہ شاید خود

میرے لیے اس لمحے وقت اپنی رفتار کھو چکا تھا۔ ہم باہر نکلے تو یہ دیکھ کر مزید حیرت ہوئی، ماما اور پاپا سلطان بابا کے ساتھ اب تک گفتگو میں مشغول تھے۔ جب کہ میرا خیال تھا کہ وہ دونوں میرے طویل انتظار سے اکتا چکے ہوں گے۔ خاص طور پر ماما کو تو ایسی جگہوں سے شدید وحشت ہوتی تھی۔ آج بھی وہ صرف میری وجہ سے یہاں آئی تھیں۔ مجھے دیکھ کر سلطان بابا کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ ابھری، ”تو تم نے اپنے والدین کو بھی خوب پریشان کئے رکھا۔ زندگی سے ضد کرنا چھوڑ دو ماماں..... کچھ صلے اس جہاں کے لیے نہیں ہوتے..... سبھی خواہشیں اس دنیا میں پوری ہونے لگیں تو پھر اگلے جہاں کے لیے کیا باقی رہ جائے گا؟“ میں نے آج تک کبھی سلطان بابا کو جواب نہیں دیا تھا، پر اس وقت میری ذہنی حالت ذہرا کے غم کی وجہ سے کچھ ایسی تھی کہ میں خود کو روک نہیں پایا..... ”لیکن کچھ خواہشیں ایسی بھی تو ہوتی ہیں کہ جن کے بدلے دونوں جہاں گروی رکھے جاسکتے ہیں۔“ سلطان بابا چونکے..... ”نہیں..... ایسی کوئی خواہش نہیں، جو وہاں کا بدل ہو..... انسان بڑا جلد باز ہے..... اسے صبر کی عادت نہیں ہے..... جو ملا وہی اس کے لیے ٹھیک ہے..... جو نہیں ملا، اسی میں اس کی بہتری ہے.....“ میں چڑسا گیا۔ ”یہ سب دل بہلانے کے بہانے ہیں۔ میں یہ دعا کیوں نہ مانگوں کہ جو مجھے نہیں ملا، مجھے اس سے ملا دے اور اسی میں میری بھلائی کا سامان بھی پیدا کر دے..... اگر مجھے اس دنیا میں بھیجا گیا ہے تو مجھے زندگی بھی تو میری اپنی مرضی کی ملنی چاہئے۔ میں نے خود تو اس دنیا میں آنے کی خواہش نہیں کی تھی..... جب اس نے بھیجا ہے تو اسے میری چاہتوں کا خیال بھی رکھنا ہوگا، مجھے اگلے جہاں کے صلوں سے کیا واسطہ۔ جو یہاں دے گا..... وہ وہاں بھی نوازے گا۔“ میں جوش جنوں میں نہ جانے کیا کچھ کہہ گیا۔ ماما نے گھبرا کر مجھے ٹوکا۔ ”ساحر..... ہوش کرو..... یہ تم سے بڑے ہیں.....“ سلطان بابا نے ہاتھ اٹھا کر ماما کو خاموش کرا دیا اور میری طرف پلٹے۔ ”اگر صرف دنیا کو قبول کرنا ہے، تب بھی راستہ جنوں سے ہو کر ہی گزرتا ہے..... تم کیا سمجھتے ہو کہ دنیا کی چاہتیں اتنی آسانی سے مل جاتی ہیں بولو..... ہمت ہے خود کو جلا کر بھسم کرنے کی؟“ ”میں ہر امتحان سے گزرنے کے لیے تیار ہوں۔“..... ”سوچ لو..... دنیا پانے کے لیے بھی کبھی کبھی سارے عیش و آرام ترک کرنا پڑتے ہیں۔ کہیں راستے میں تھک کر پلٹ تو نہیں جاؤ گے؟“ میں نے شاید زندگی میں پہلی مرتبہ سلطان بابا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں۔ ”آزمائش شرط ہے۔“ سلطان بابا مسکرائے۔ ”ٹھیک ہے..... آزماتے لیتے ہیں..... ہم نے عبداللہ کا تاولہ کسی اور قصبے میں کر دیا ہے تمہارے جنوں کی پہلی آزمائش یہی ہے کہ جلد از جلد اپنا گھر بار اور یہ عیش و عشرت چھوڑ دو اور اس درگاہ میں بسیرا کر لو۔ تمہیں یہاں لوگوں کی خدمت کے ساتھ ساتھ اپنے گزر بسر کے لیے بھی کوئی مزدوری کرنا ہوگی۔ جیسے عبداللہ کرتا تھا۔ دو دن کے بعد میں اور عبداللہ یہاں سے اپنے سفر پر کوچ کر جائیں گے، تب تک کوئی فیصلہ کر لو لیکن یاد رہے..... تمہارے والدین ماشاء اللہ حیات ہیں..... لہذا جو بھی قدم اٹھاؤ، اس میں ان کی رضا مندی بہت ضروری ہے۔ ان کی ناراضی کبھی مول نہ لینا۔“ سلطان بابا میرا کان دھا تھپک کر آگے بڑھنے لگے، پھر نہ جانے کیا سوچ کر دوبارہ پلٹے اور میری جانب دیکھ کر ہلکے سے مسکرائے ”اب بھی وقت ہے، گھر جا کر ٹھنڈے دل سے اپنے فیصلے پر غور کرو۔ دنیا خود طے طے ورنہ اسے پانا چاہو تو یہ انسان سے بھاگتی ہے۔ اس کا حصول بھی بڑا جو حکم ہے۔ کیوں خود کو اس جھیلے میں ڈالتے ہو۔ تمہیں جو ملا ہے وہ بھی کچھ کم تو نہیں۔ ایک خواہش نہ سہی اور ہزاروں ارمان تو پورے ہوئی رہے ہیں۔ یاد رکھو، یہ جنوں بھی ہر ایک کو اس نہیں آتا.....“ میرے منہ سے خود بخود نکل گیا۔ ”جو اس جنوں میں پڑ جائیں پھر انہیں کسی راس، یا بے راسی کا دھیان ہی کب رہتا ہے..... جو ہوگا دیکھا جائے گا.....“ سلطان بابا کچھ دیر تک میری آنکھوں میں کچھ تلاش کرتے رہے۔ مجھے



ان کی آواز بہت دور سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔ ”پھر بھی میری یہی دعا ہے کہ تمہیں یہ جنوں راس آ جائے۔۔۔۔۔“ سلطان بابا آگے بڑھ گئے۔

میرے ماں باپ میرے قریب ہی کھڑے حیرت اور پریشانی سے میرے اور سلطان بابا کے درمیان مکالمہ سن رہے تھے۔ میری نظر عبداللہ کے چہرے پر پڑی جہاں تفکر کی نمی پر چھائیں اپنی جگہ بنا رہی تھیں، مگر میرے دل نے بہت دیر سے مجھ سے کہا۔

جو نہ مل سکے، وہی بے وفا  
یہ بڑی عجیب سی بات ہے  
جو چلا گیا مجھے چھوڑ کر  
وہی آج تک میرے ساتھ ہے



**We at Paksociety.com giving you the facility to download urdu novels,Imran series,Monthly digests with direct links and resumeable direct link along with the facility to read online on different fast servers**

**If site is not opening or you find any issue in using site send your complaint at admin@paksociety.com**

**or  
send message at  
0336-5557121**

## تعیناتی

سلطان بابا نے زہرا کو پانے کے لیے جس کڑے امتحان سے گزرنے کا چیلنج دیا تھا میں اسے صدق دل سے قبول کر چکا تھا۔ لیکن انہوں نے اس امتحان میں بیٹھنے کے لیے میرے والدین کی رضامندی کی جو ذیلی شرط لگائی تھی وہ میرے لیے اس آزمائش سے بھی بڑا امتحان تھا۔ اس روز درگاہ سے واپسی پر ماما اور پاپا دونوں ہی بالکل خاموش، خیالوں میں گم صم سے تھے۔ شاید ان دونوں کے ذہن میں بھی یہ سوال کہیں نہ کہیں گردش کر رہا ہوگا کہ ان کا اس قدر نازوں پلائیٹا انجانے میں سلطان بابا سے بہت بڑی شرط تو لگا آیا ہے لیکن جس کی سازی زندگی ٹھکل پرکئی ہو، کیا وہ کبھی ٹاٹ برداشت کر سکتا ہے اور پھر میں تو اکلوتی اولاد کے علاوہ مزاج بھی کافی نازک مزاج تھا۔ میں نے زندگی میں کبھی کوئی تکلیف، یا مشقت جھیلنا تو دور، اس کا برائے نام سامنا بھی نہیں کیا تھا۔ میری ماں کے بقول ”میرا تو رنگ بھی چند لمحوں کی دھوپ سے کھلا سا جاتا تھا۔“ تو پھر اس وقت ان کے ذہن میں اٹھتے سوال بھی تو بجا ہی تھے، لیکن میں حتمی فیصلہ کر چکا تھا کہ اب مجھے کیا کرنا ہے۔

گھر کے پوریج میں گاڑی رکھتے ہی میں ہٹا کسی سے کوئی بات کہنے اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔ میری توقع کے عین مطابق ٹھیک آدھے گھنٹے کے بعد کاشف کا فون آ گیا۔ ”ساحر تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے..... میں یہ کیا سن رہا ہوں.....“ میں جانتا تھا کہ ماما گھر میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلی کال کاشف ہی کو کریں گی۔ میری ضد کے سامنے جب کبھی ماما پاپا ہارنے لگتے تھے تو ایسے میں کاشف ہی ان کا آخری سہارا ہوا کرتا تھا۔ ”بولونا..... چپ کیوں ہو.....؟“ لیکن یاد رکھنا، ہم سب تمہیں اس پاگل پن کی اجازت ہر گز نہیں دیں گے۔ غضب خدا کا..... شہر کا سب سے بڑا کیسٹونو (Casonova) ساحر رضا ایک درگاہ کا مجاور بننے چلا ہے..... خبردار! جو تم نے اس حماقت کے بارے میں مزید کچھ سوچا بھی تو.....؟“ کاشف اپنی رو میں نہ جانے کیا کچھ بولتا گیا۔ میں چپ چاپ اس کا لیکچر ختم ہونے کا انتظار کرتا رہا۔ اس کی قبیحی کی طرح چلتی زبان رکی تو میں نے اسے چھیڑنے کے لیے ایک لمبی سرد آہ بھری۔ ”وحشی کو سکون سے کیا مطلب..... جوگی کا گھر میں ٹھکانہ کیا.....؟“ ”فارگا ڈسک ساحر..... یہ ساری باتیں صرف کتابوں میں اچھی لگتی ہیں اور پھر تمہارا واحد مقصد تو صرف اور صرف زہرا کو پانا ہی ہے نا.....؟ تو اس کے حصول کے اور بھی بہت سے طریقے ہیں، تمہیں اس کے لیے یہ جوگ لینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔“ مجھے کاشف کے ناصحانہ انداز پہ ہنسی آ گئی۔ ”اچھا..... بھلا وہ کون سے طریقے ہیں..... ذرا میں بھی تو سنوں۔“ ”میری بات مذاق میں مت اڑاؤ ساحر..... تم نے اپنی چند دن کی بے ہوشی کے دوران ہریان میں بہت سے راز افشا کر دیئے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ وہ لڑکی وہاں صرف اس درگاہ کے متولی عبداللہ کے لیے آئی تھی۔ آج مجھے آنٹی سے یہ بھی پتا چلا ہے کہ سلطان بابا عبداللہ کو لے کر کسی لمبے سفر پر جا رہے ہیں۔ مطلب یہ کہ عبداللہ کی صورت میں تمہارا رقیب زہرا کی نظروں کے سامنے نہیں رہے گا۔ مجھے یقین ہے کہ تب تمہاری محبت کا وارا ایک نہ ایک دن کارگر ضرور ثابت ہوگا۔ زہرا تمہارے پاگل پن کے سامنے زیادہ دن تک مزاحمت نہیں کر پائے



گی۔ تم صرف انتظار کرو سacher۔ جلد بازی میں کوئی قدم نہ اٹھانا میری جان۔۔۔۔۔ ہم سب تم سے بے حد پیار کرتے ہیں۔۔۔۔۔“ بولتے بولتے کاشف کی آواز کچھ بھرا سی گئی۔ وہ ایسا ہی تھا جذباتی سا۔ میں نے ماحول بدلنے کے لیے بات بدلی۔ ”خدا کے لیے یہ رونے دھونے کا فریضہ تم مہاک کے لیے ہی چھوڑ دو۔۔۔۔۔ خبردار جو تم نے میری دوسری ماں بننے کی کوشش کی۔۔۔۔۔ ارے یا تم لوگ سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے۔۔۔۔۔ مجھے سلطان بابا نے ایک چیلنج دیا ہے اور میں صرف اس کسوٹی پر پورا اترنا چاہتا ہوں اور شاید تم بھول رہے ہو، ایسے چیلنج ہم روزانہ ایک دوسرے کو دیا کرتے تھے۔ یاد ہے تمہیں، پچھلے سال ہی ہم نے چولستان کے صحرا میں چند دن درگاہ میں رہنا ہوگا۔ تمہارا کیا خیال ہے کہ میں باقاعدہ مجاہد بننے کے لیے درگاہ جا رہا ہوں۔۔۔۔۔؟“

دوسری جانب سے کاشف کی مشکوک سی آواز سنائی دی۔ ”میں کیسے مان لوں کہ یہ سارا معاملہ صرف ایک شرط، یا چیلنج کی حد تک ہی رہے گا۔ مجھے تمہارے دیوانے پن سے ڈر لگتا ہے۔“ میرے منہ سے بے اختیار ایک دوسرا مصرعہ نکل گیا۔ ”دیوانوں کی سی نہ بات کرے۔۔۔۔۔ تو اور کرے دیوانہ کیا؟“ کاشف ہنس پڑا۔ ”تم کبھی نہیں سدھرو گے سacher۔۔۔۔۔ بہر حال میری تشویش کافی حد تک دور ہو گئی ہے۔ لیکن فی الحال مجھے آنٹی کی تشویش دور کرنی ہے، وہ اور انکل تمہارے اس نئے ایڈوکیٹ کی وجہ سے بے حد پریشان ہیں۔“ میں نے کاشف کو جھاڑا۔ ”زیادہ چچہ گیری کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ ہو سکے تو مہاپا کو بھی میرا نقطہ نظر اسی طرح سمجھانے کی کوشش کرنا، جیسے میں نے ابھی تمہیں بتایا ہے اور خبردار، جو اپنی طرف سے ذرا سی بھی کوئی افلاطونی جھاڑنے کی کوشش کی تو!“ کاشف نے ہنستے ہوئے فون رکھ دیا۔ میں نے کاشف کو تو کسی نہ کسی طور سمجھا دیا تھا، لیکن میں یہ بھی اچھی طرح جانتا تھا کہ اپنے والدین کو سمجھانا کس قدر مشکل مرحلہ ہوگا۔

اس رات نہ جانے کیوں مجھے یعنی بہت ٹوٹ کر یاد آئی۔ وہ بھی تو میرے لیے اسی آگ میں جلتی رہی تھی، جس میں آج میں زہرا کے لیے جل رہا تھا۔ مجھے یاد آیا کہ کینیڈا کا اسکاٹسٹ لینے سے پہلے وہ درگاہ کی سیڑھیوں پر مجھ سے آخری بار ملی تھی تو کس قدر کرچی کرچی تھی وہ۔۔۔۔۔ میں اس وقت اس کے جذبے کی کاٹ کو محسوس نہیں کر پاتا تھا، لیکن آج جب خود میرے اوپر یہ قیامت گزر رہی تھی تو مجھے اس کی ہر بات یاد آ رہی تھی۔ میں جانتا تھا کہ وہ خود تو کبھی مجھے بددعا نہیں دے سکتی تھی، لیکن شاید کبھی کبھی خدا جذبوں کو کبھی دعا، یا بددعا دینے کا اختیار دے دیتا ہے اور شاید آج میری اس حالت کے پیچھے بھی یعنی کے کسی ایسے ہی جذبے کی بددعا کا عمل دخل تھا۔ کوئی ایسا جذبہ جس کے آگینے کو میری لاپرواہی سے ٹھیس لگی ہوگی۔ اگلی صبح بے حد بوجھل تھی۔ ناشتے کی میز پر مہاک آ نکھیں صاف چغلی کھا رہی تھیں کہ وہ رات بھر نہیں سوئی۔ پیابھی چپ چپ سے تھے اور پھر بالآخر انہوں نے ہی یہ خاموشی توڑی۔ ”سacher بیٹا تمہاری ماما تمہارے اس فیصلے سے بے حد ڈر رہے ہیں۔ میں تو کہتا ہوں بیٹا اس بزرگ کی بات کو اتنا سیریس لینے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے ابھی ہمت نہیں ہاری ہے۔ ہم ایک بار پھر زہرا کا رشتہ لے کر جائیں گے اور مجھے امید ہے کہ جلد، یا بدیر ہم انہیں منا ہی لیں گے اور اس کے لیے تمہیں کسی بھی شرط وغیرہ کے چکر میں پڑنے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں ہے۔“ میری توقع کے مطابق کاشف نے بہت تفصیل سے مہاپا سے بات کی تھی۔ ”کیوں پیابھی۔۔۔۔۔ کہیں آپ دونوں کو یہ ڈر تو نہیں کہ اس درگاہ میں رہتے رہتے کہیں میرا من بھی مذہب کی طرف متوجہ نہ ہو جائے اور فرض کریں، اگر ایسا ہو بھی گیا تو اس میں برائی ہی کیا ہے؟ مجھے تو یہ سودا دونوں طرف سے فائدے کا ہی لگتا ہے۔ آخر ہم سب مذہب سے

اس قدر خوف زدہ کیوں رہتے ہیں۔ یہ کیا آسیب ہے جس کا ڈر ساری زندگی ہمارے ارد گرد بھٹکتا رہتا ہے اور ہم تمام عمر اس سے بھاگتے ہی رہتے ہیں۔ کیوں ایک بار رک کر، پلٹ کر اس چیز کا سامنا نہیں کر لیتے۔ آخر مذہب ہم سے ہمارا کیا چھین لے گا؟“ ”مما اور پپا نے آج تک کبھی میرے منہ سے اس قسم کی باتیں نہیں سنی تھیں۔ وہ دونوں ہی حیرت زدہ سے بیٹھے تھے۔ پپا نے ایک لمبی سی سانس لی۔“ ”ہاں..... شاید ہم خوف زدہ ہیں، ہر اس چیز سے جو تمہیں ہم سے دور لے جاسکتی ہو۔ پھر چاہے وہ مذہب ہی کیوں نہ ہو اور اکلوتی اولاد کے ماں باپ ہونے کے ناطے، یہ خوف ہمارا حق ہے اور یہ حق ہم سے ہمارا مذہب بھی نہیں چھینتا، شاید اسی لیے اس بزرگ نے تمہیں بھی یہ حق یاد دلایا تھا۔“ ”مما بولیں تو ان کی آواز کچھ بھرائی ہوئی تھی۔“ ”اور پھر بیٹا..... یہ تو پاگل پن ہے کہ صرف ایک لڑکی کے حصول کے لیے تم دنیا کے باقی سبھی رشتوں کو بھلا دو..... کیا ہم تمہارے کچھ نہیں لگتے؟“ ”آپ دونوں میرے لیے دنیا کی ہر چیز سے بڑھ کر ہو، لیکن میری روح کے دھاگے قدرت نے اس لڑکی سے باندھ دیئے ہیں مما..... میرا دم اس کے بغیر گھٹتا ہے۔ اگر یہ نا انصافی ہے تو یقین کریں کہ میرا اس میں کوئی قصور نہیں ہے۔ سارا قصور اس جذبے کا ہے، اس جذبے کی شدت کا ہے، جس نے میری روح کو اس کا قیدی بنا دیا ہے۔ آپ بتائیں میں کیا کروں؟ کہاں جاؤں؟“

وہ دونوں ہی چپ چاپ لا جواب سے بیٹھے رہے۔ اٹنے میں ڈاکٹریز وانی کا فون آ گیا۔ انہوں نے مجھ سے بات کر کے اپنی کلینک آنے کا کہا۔ شاید کچھ مزید ٹیسٹ وغیرہ کرنا چاہتے تھے۔ پہلے تو میں نے نالنا چاہا، پھر مما اور پاپا کا موڈ دیکھ کر ہای بھر لی۔ پپا نے ڈرائیور کو گاڑی نکالنے کا کہا اور ہم سبھی ڈاکٹر کے کلینک چل پڑے، جہاں سے کافی دیر بعد ہماری واپسی ہوئی۔ واپسی پر سارے راستے مما پپا سے میری بحث جاری رہی وہ دونوں کسی صورت مجھے اجازت دینے پر راضی نہیں تھے۔ ”مما تو باقاعدہ رو رہی تھیں۔“ ”ساحر..... تم ہوش میں تو ہو..... اتنا پڑھ لکھ کر تم اس درگاہ کی نوکری پر لگ جاؤ گے..... لوگ کیا کہیں گے؟“ ”آپ کو لوگوں کی فکر ہے، یا اپنے بیٹے کی اور پھر مجھے ویسے بھی تو ماسٹرز کے لیے انگلینڈ جانا ہی تھا۔ آپ یہی سمجھنے لگے کہ میں اعلیٰ تعلیم کے لیے گھر سے باہر ہوں..... بلکہ وہاں سے تو ویک اینڈ اور عید وغیرہ پر گھر آنا بھی ناممکن تھا، جب کہ یہاں سے میں آسانی سے آپ سے ملنے آ سکتا ہوں۔ آپ کو میری دوری محسوس بھی نہیں ہوگی۔“ ”کم آن ساحر“ اب پپا کی باری تھی۔ ”انگلینڈ سے ماسٹرز کرنے اور ایک درگاہ کا متولی بن کر رہنے میں بہت فرق ہے۔ ہم تمہیں مولوی نہیں، ایم بی اے بنانا چاہتے ہیں۔“ ”گھر میں بھی یہی بحث جاری رہی۔“ ”دنیا کے سبھی والدین یہ کیوں چاہتے ہیں کہ ان کا بیٹا پڑھ لکھ کر ڈاکٹر، انجینئر، یا پائلٹ ہی بنے؟ میں وہاں مولوی بننے نہیں جا رہا، کیونکہ شاید لغت میں یہ لفظ جن کے لیے موجود ہے، وہ بہت با علم اور بڑے لوگ ہوتے ہیں۔ میں تو صرف اپنی غرض کے لیے یہ راستہ اختیار کر رہا ہوں۔ لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ دنیا کے کوئی بھی والدین اپنی مرضی سے اپنے کسی ایک بچے کو بھی دین کی راہ پر کیوں نہیں ڈالتے۔ آپ کے ذہن میں مولوی کا جو تاثر ہے، وہ بھی کسی ایسے انسان ہی کا ہے، جو زندگی میں اور کچھ نہیں کر پاتا تو اس نے یہی کام بطور پیشہ اختیار کر لیا۔ پھر ہمیں گلہ کس بات کا ہے؟ جب ہم اپنی اولاد ہی کو اس راستے پر چلنے کی اجازت نہیں دیتے تو پھر جو اس خدمت میں مشغول ہیں، ان کی کم علمی پر پتھر اچھالنے کا بھی بھلا ہمیں کیا حق ہے؟ پاپا بڑبڑا ہو گئے۔ ”لیکن ہماری سوسائٹی اسے قبول نہیں کر پائے گی۔“ ”سوسائٹی کے قانون ہم خود بناتے ہیں پپا..... آپ نے ساری عمر میں اتنا کم لیا ہے کہ اگر آپ کی اگلی سات نسلیں بھی بیٹھ کر کھاتی رہیں تو یہ دولت ختم نہیں ہوگی، لیکن مجھے اپنے آپ کو پانے کا موقع شاید یہ زندگی



دوبارہ کبھی ندے..... مجھے اس راہ پر چلنے دیں..... اگر یہی میرا مقدر ہے تو مجھے اسے جھیلنے دیں..... آپ جانتے ہیں کہ اگر میں اس گھر میں قید رہا تو میری روح ہمیشہ کے لیے دو کٹڑوں میں تقسیم ہو جائے گی۔ مجھے اپنے دل اور دماغ کی یہ جنگ لڑ لینے دیں۔ جیت دل کی ہو، چاہے دماغ کی..... اصل فاتح آپ کا بیٹا ہی ہوگا۔“

میں مہاپا کو شش و پنج میں چھوڑ کر اپنے کمرے میں چلا آیا۔ ساری رات مہاپا کے زور زور سے بولنے کی آوازیں آتی رہیں۔ لیکن میں جانتا تھا کہ میری حالت کے پیش نظر مہاپا آخر کار مہا کو مننا ہی لیں گے اور پھر یہی ہوا، صبح جب میں ناشتے کی میز پر پہنچا تو مہا کی آنکھیں سو جی ہوئی تھیں، شاید وہ رات بھر روتی رہی تھیں۔ میں نے ان کا دل بہلانے کے لیے بات شروع کی ”آپ جانتی ہیں کہ اگر آپ یونہی روتی رہیں تو میں جا نہیں پاؤں گا..... سلطان بابا کی لگائی ہوئی شرط کا فائدہ اٹھا رہی ہیں کیا؟“ ان کے ہونٹوں پر دھیمی سی مسکراہٹ ابھری۔ ”بہت صدمی ہو ساجر..... لیکن ایک وعدہ کرنا ہوگا کہ ہر ہفتے گھر آؤ گے اور ہمارا بھی جب کبھی دل چاہے گا، ہم تم سے ملنے وہاں آ سکیں گے..... خدا کرے تمہارا یہ جنون جلد ختم ہو..... مجھے تمہاری بہت فکر رہے گی۔“ اور پھر مہاپا کی ایسی بہت سی فکروں اور ان دونوں کی جھگی پلکوں کے سائے میں، میں گھر سے رخصت ہو گیا۔ وہ دونوں مجھے درگاہ تک چھوڑنے کے لیے آنا چاہتے تھے، لیکن میں نے بڑی مشکل سے انہیں گھر ہی میں روک دیا۔ میں جانتا تھا کہ مہا کا دل بہت نازک ہے اور وہ زیادہ دیر اپنے فیصلے پر قائم نہیں رہ پائیں گی۔ سلطان بابا کی شرط کے مطابق میں گھر سے خالی ہاتھ ہی نکلا تھا۔ درگاہ کے صحن میں قدم رکھا تو سلطان بابا اور عبداللہ کو سفر کے لیے تیار پایا۔ سلطان بابا نے غور سے مجھے دیکھا ”..... ہاں میاں..... اپنے والدین کی اجازت سے آئے ہونا.....“ جی ہاں..... بڑی مشکل سے اجازت ملی ہے، لیکن آ گیا ہوں.....“ عبداللہ مسکرایا۔ ”میں جانتا تھا..... تم ضرور آؤ گے..... آؤ میں تمہیں کچھ ضروری باتیں سمجھا دوں۔“ عبداللہ نے کچھ ہی دیر میں مجھے تمام معمولات سے آگاہ کر دیا اور پھر اتنے میں ان کے جانے کا وقت بھی ہو گیا۔ سلطان بابا جاتے جاتے رکے اور میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر بولے ”پہلا پڑاؤ تو تم نے کامیابی سے طے کر لیا۔ ثابت قدم رہے تو اپنی مراد بھی پالو گے ایک دن..... جیتے رہو.....“ عبداللہ نے جاتے ہوئے مجھے زور سے گلے لگا لیا۔ میں نے اس کا ہاتھ تھام کر کہا۔ ”سچ تو یہ ہے کہ میں اندر سے اب تک دھوڑ میں بنا ہوا ہوں۔ دعا کرنا کہ میں یہ ذمہ داری ٹھیک طرح سے سرانجام دوں، انہیں میرے قدم نہ لڑکھڑا جائیں.....“ عبداللہ نے میرا ہاتھ زور سے تھام لیا اور مسکرا کر بولا۔ ”گرتے ہیں شہسوار ہی میدان جنگ میں۔“ پھر آگے بڑھتے بڑھتے اسے جیسے کوئی ضروری بات یاد آ گئی۔ اس نے جلدی سے اپنے کرتے کی جیب سے ایک پرچی نکالی اور میرے ہاتھ میں تھما دی۔ میں ایک ضروری بات تو تمہیں بتانا بھول ہی گیا تھا۔ سلطان بابا نے تمہارا اپنا نام رکھ دیا ہے۔ دیسے ہی جیسے میرا رکھا گیا تھا، جب میں یہاں پر آیا تھا۔ اس پرچی پر لکھا ہے، ہمارے جانے کے بعد دیکھ لینا۔ لوگ اب تمہیں اس نام سے پکارتے گے یہاں.....“ یہ ایک نئی حیرت تھی میرے لئے۔ ”کیا؟ یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ کیا یہاں آنے سے پہلے تمہارا کچھ اور نام تھا..... کیا نام تھا تمہارا.....“ ”عدنان..... عامر عدنان نام تھا، پہلے میرا..... اچھا اب چلوں..... سلطان بابا بہت دیر سے دروازے پر کھڑے ہیں..... نئی جگہ پر پہنچ کر خط لکھوں گا..... اپنا خیال رکھنا..... فی امان اللہ۔“

عبداللہ مجھے گلے لگا کر آگے بڑھ گیا اور میں جانے کتنی دیر حیرت میں ڈوبا، گم صم وہاں کھڑا رہا..... ڈھلتے سورج کی ڈوبتی کرنوں میں دور

نیچے ساحل کے آخری کنارے پر میں نے عبداللہ اور سلطان بابا کے ہولے کو آخری بار اوجھل ہوتے ہوئے دیکھا۔ تب ہی اچانک مجھے اپنے ہاتھ میں پکڑی کاغذ کی اس پرچی کا خیال آیا، جو جاتے وقت عبداللہ مجھے دے گیا تھا۔ کچھ عجیب سی کیفیت میں لرزتے ہاتھوں سے وہ پرچی کھولی۔ پرچی پر لکھا ہوا نام میری ہتھیلی کے پسینے سے بھیگ کر پھیلنے لگا تھا، میرے ذہن میں جیسے ایک ساتھ ہی کئی جھکڑ سے چلنے لگے۔ پرچی پر اپنا نیا نام دیکھ کر میرے قدم لڑکھڑاسے گئے، میرا نیا نام تھا..... ”عبداللہ“



**We at Paksociety.com giving you the facility to download urdu novels,Imran series,Monthly digests with direct links and resumeable direct link along with the facility to read online on different fast servers**

**If site is not opening .or you find any issue in using site send your complaint at admin@paksociety.com**

**or**

**send message at  
0336-5557121**



## عبداللہ

میں جانے کتنی دیر سے اپنے نام کی پرچی ہاتھ میں لئے، اپنے آس پاس چلتی غیر مرئی سی آندھیوں کے شور میں وہیں درگاہ کے صحن میں کھڑا تھا۔ سلطان بابا اور عبداللہ کو گئے بہت دیر ہو چکی تھی اور اب رات کا اندھرا دھیرے دھیرے درگاہ کو اپنی لپیٹ میں لے رہا تھا۔ سلطان بابا نے آج سے میری ایک نئی شناخت تجویز کر دی تھی۔ اب میں ساحر نہیں عبداللہ تھا۔ مجھ سے پہلے یہاں کوئی اور عبداللہ تعینات تھا۔ گویا حاکم بابا اور سلطان بابا بھی اصل میں حاکم اور سلطان نہیں تھے، ان کے اصل نام بھی کبھی کچھ اور ہوں گے اور پھر وہ بھی یونہی عبداللہ کے عہدے سے ترقی کر کے پہلے حاکم اور پھر سلطان بنے ہوں گے.....؟ عہدوں کا یہ سلسلہ کہاں جا کر ختم ہوتا ہوگا.....؟ میں جس قدر سوچتا رہا، اسی قدر الجھتا چلا گیا۔ لیکن میں تو یہاں چند دن کے لیے عارضی طور پر آیا تھا اور میرا مقصد صرف اور صرف زہرا کا حصول تھا۔ مجھے تو زہرا کو کاپاتے ہی اپنی اصل دنیا کی جانب لوٹ جانا تھا، تو پھر سلطان بابا نے اس عارضی مقصد کو پانے کے لیے میری باقاعدہ ”عبداللہ“ کے عہدے پر تعیناتی کیوں کر دی تھی.....؟ کیا اس دکھاوے کا مقصد بھی کہیں اس سنگ مرمر کی صورت کو پگھلانا تو نہیں تھا؟

رات اب باقاعدہ اور پوری طرح سے تمام ساحل پر اپنے پنجے گاڑھ چکی تھی۔ درگاہ میں بجلی کا انتظام نہیں تھا۔ میں نے عبداللہ کی دی ہوئی ہدایات کے مطابق درگاہ میں رکھے ہوئے چند مٹی کے چراغ روشن کر دیے۔ انہی ہدایات میں یہ بات بھی کہیں درج تھی کہ مٹی کے ان دیوں کے لیے تیل خریدنے کا اہتمام بھی مجھے اپنی مزدوری کے پیسوں ہی سے کرنا تھا۔ فی الحال، کچھ تیل ان چراغوں میں باقی تھا۔ دفعۃً تنہائی اور اداسی کی ایک بھرپور لہر نے میرے پورے وجود کو جیسے لرزاسا دیا۔ مجھے اپنے والدین، دوست، رنگین زندگی کی رومانی شامیں اور مدہوش سی راتیں بری طرح یاد آنے لگیں۔ مجھے یاد آیا کہ اس وقت اگر کبھی میں خوش قسمتی سے گھر میں موجود ہوتا تھا تو ماما کیسے بھاگ بھاگ کر بچن میں کلک کو میرے لیے مختلف ڈشز تیار کرنے کا حکم دیتی رہتی تھیں، پاپا جلدی سے شطرنج کی بازی جمالیتے تھے اور ان کی ہمیشہ کوشش رہتی کہ وہ مجھ سے جیتنے کے بجائے ہارتے جائیں۔ نہ جانے انہیں مجھ سے ہارنے میں اتنا لطف کیوں آتا تھا؟ میں اپنی ساری دنیا تیاگ کر، اس اندھیری رات میں یہاں اس ویران درگاہ میں کیا کر رہا تھا.....؟ یہ میں نے کیسا سودا کر لیا تھا؟ یہ سب کچھ سوچ کر دل جیسے کٹنے سا لگا۔ جتنی تنہائی اور اداسی میں نے درگاہ کی اس پہلی رات میں اپنی روح کے اندر اترتی محسوس کی، ویسی تو کبھی زندگی بھر نہیں جھیلی تھی۔ کہتے ہیں، رات کافسوں ہر چیز کی حقیقت کو اس کی اصل شدت سے کہیں زیادہ ابھار کر پیش کرتا ہے۔ شاید میرے ساتھ بھی ذہنی رات کا جاوودہی کھیل کھیل رہا تھا۔ میں بہت دیر تک درگاہ کی بیرونی دیوار کے ساتھ ٹپک لگا کر دور شور مچاتے ساحل کو دیکھتا رہا۔ کنارے سے کچھ فاصلے پر ایک بحری جہاز میری طرح تنہا سمندر کی لہروں پر ڈول رہا تھا۔ دور سے جب اس کی ٹمنماتی تیاں لہو بھر کو چمکتیں تو مجھے ایسا لگتا کہ جیسے وہ بھی حیرت سے میری جانب دیکھ رہی ہیں کہ یہ ”بخارہ“ اس ویرانے میں اکیلا بیٹھا کیا کر رہا ہے؟ ایسے ہی نہ جانے کتنے خیالات کی یلغار میں

رات کے کسی پہر میری آنکھ لگ گئی اور پھر اچانک ہی مجھے یوں لگا، جیسے کسی نے دھیرے سے میرا کاندھا چھوا ہو۔ میں نے جھٹکے سے پلکیں کھولیں تو صبح ہونے کو تھی۔ کوئی شخص میرے قریب بیٹھا میرا کاندھا ہلارہا تھا۔ ”اٹھ جاؤ بھائی..... نماز کا وقت ہونے والا ہے۔“ کچھ دیر تو مجھے سمجھ ہی نہیں آیا کہ میں کہاں ہوں۔ میں نے گھبرا کر سامنے بیٹھے شخص کو دیکھا جو اپنے حلیے سے مقامی مجھیرا لگتا تھا۔ وہ پھر گویا ہوا ”نماز کھڑی ہونے والی ہے..... اٹھ جاؤ.....“ میں نے اس کے اشارے کے تعاقب میں نظر دوڑائی تو درگاہ کے بالکل سامنے والی چٹان پر پتھر کی ایک چھوٹی سی مسجد بنی ہوئی تھی۔ مجھے یاد آیا کہ سلطان بابا کے احکامات میں سے ایک حکم پانچویں وقت کی نماز پڑھنے کا بھی تھا، لیکن مجھے تو نماز پڑھ جانے کتنے سال گزر چکے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ مجھے اس وقت فجر کی نماز کی پوری رکعتیں بھی یاد نہیں تھیں۔ بہر حال میں نے جلدی سے اٹھ کر منہ پر پانی کے چند چھینٹے مارے۔ بھلا ہوان چند نمازیوں کا جو مسجد کے باہر بنے چھوٹے سے حوض کے کنارے وضو کر رہے تھے، تو میں نے بھی انہی میں سے ایک کے قاعدے کو پوری طرح نقل کیا اور مسجد میں داخل ہو گیا۔ میرے ساتھ دو نمازی اور بھی مسجد میں داخل ہوئے تھے اور دونوں ہی نے جلدی سے شاید سنتوں کی نیت باندھ لی۔ میں نے بھی انہی کی تقلید کی اور ان کے ساتھ ہی سلام پھیر دیا۔ کچھ ہی دیر میں مولانا صاحب بھی تشریف لے آئے اور جماعت کھڑی ہو گئی۔ انہوں نے جب پہلی رکعت شروع کی تو مجھے دھیرے دھیرے بچپن میں اپنے اسلامیات کے ٹیچر کی حفظ کروائی ہوئی نماز اور سورتیں یاد آنے لگیں۔ کتنی عجیب بات تھی، ہم مذہب کو چاہے کتنا بھی بھلا دیں..... مذہب نہیں بھلاتا۔ وہ کسی ٹیٹھی یاد کی طرح ہمارے دل کی نہاں خانوں میں کہیں نہ کہیں چھپا رہا ہے۔ جب تک مولانا صاحب نے سلام پھیرا، میرے ذہن اور دل کے تمام درتے وا ہو چکے تھے۔ مجھے بہت کچھ یاد آ چکا تھا۔

نماز کے بعد وہ نورانی چہرے والے امام ہماری طرف پلٹے اور کھنکھار کر کہنے لگے۔ ”ہاں، بھئی ساتھیو..... تو کل ہم نے درس کہاں ختم کیا تھا۔“ مقتدیوں میں سے ایک نے جلدی سے لقمہ دیا۔ ”مولانا صاحب..... آپ حضرت سلیمان علیہ السلام کے قصے تک پہنچے تھے۔“ پیش امام نے ایک لمبا سا ہنکارا بھرا اور غور سے ہم سب کی طرف دیکھا۔ ”ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا دربار لگا ہوا تھا، سبھی درباری مؤدب بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک شخص نہایت گھبرایا ہوا سا ان کے دربار میں حاضر ہوا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں سی اڑ رہی تھیں۔ وہ آتے ہی حضرت سلیمان علیہ السلام کے قدموں میں گر گیا کہ اس نے ابھی ابھی حضرت عزرائیل علیہ السلام یعنی ملک الموت کو حضرت سلیمان علیہ السلام کے دربار کے باہر دیکھا ہے اور اسے یقین ہے کہ وہ اسی کی روح قبض کرنے کے لیے آج یہاں آئے ہیں، لہذا اس کی گزارش ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام ہواؤں کو حکم دیں کہ فوراً اسے اپنی طاقت سے اڑا کر دنیا کے دوسرے کونے میں پہنچا آئیں۔ ساتھیو، آپ تو جانتے ہیں کہ خدا نے حضرت سلیمان علیہ السلام کو بڑی طاقت عطا کی تھی۔ تمام جنات، ہوائیں، سب چرند پرند، حضرت سلیمان علیہ السلام کے تابع تھے، تو حضرت سلیمان علیہ السلام نے فریادی کی، فریاد قبول کر لی اور ہوا کو حکم دیا کہ اس شخص کو بل بھر میں دنیا کے آخری سرے تک پہنچا آئے۔ ہوائے حکم کی تعمیل کی اور ابھی دربار لگا ہی ہوا تھا کہ حضرت عزرائیل علیہ السلام بھی کسی بھیس میں اس دربار میں آ پہنچے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے بطور مزاح ان سے پوچھا کہ ”کیوں حضرت..... آج تک اتنی جانی قبض کی ہیں، کبھی کبھار مشکل بھی پیش آئی.....؟“ حضرت عزرائیل علیہ السلام نے جواب دیا ”ہاں آج ایک عجیب واقعہ ہوا، جس نے کچھ دیر کے لیے تو مجھے بھی سوچ میں ڈال دیا۔ ہوا یہ کہ آج مجھے دنیا کے دوسرے سرے پر ایک شخص کی روح قبض کرنے کا حکم ملا تھا، لیکن ابھی چند



لمحے پہلے میں نے جب اسی شخص کو آپ کے دربار کے باہر دیکھا تو میں خود بھی متزلزل ہو گیا کہ یہ شخص تو یہاں موجود ہے، جب کہ میری فہرست کے مطابق مجھے یہاں سے ہزاروں میل دور اسے بے جان کرنا تھا۔ لیکن ایک لمحہ پہلے جب میں اس مقام پر پہنچا، جہاں اس شخص کا آخری سانس لکھا تھا تو وہ وہاں مجھ سے پہلے موجود تھا..... سچ ہے..... خدا کے کام خدا ہی جانے.....“ مولانا صاحب نے قصہ ختم کر کے تمام نمازیوں کی طرف دیکھا، جو سبھی دم سادھے مودب بیٹھے تھے۔ انہوں نے سب سے سوال کیا۔ ”ہاں تو سنا تھیو..... اس واقعے سے آپ کو کیا سبق ملا.....؟ یہی نہ کہ موت سے کسی کو رخصت نہیں۔ ہر ذی نفس کو اس کا ذائقہ چکھنا ہوگا۔ چاہے انسان کتنی ہی تدبیر کیوں نہ کر لے، تقدیر پھر بھی اٹل ہے اور یہ بھی طے ہے کہ جس کی موت جہاں آئی ہے، قدرت اسے خود وہاں پہنچا دیتی ہے اور تب تک موت خود زندگی کی حفاظت کرتی رہتی ہے.....“ سب نمازیوں نے زور سے سر ہلا کر مولانا صاحب کی باتوں کی تائید کی۔ یہ آس پاس کی بستیوں کے چند ٹھہرے تھے جو درمیان سورے سمندر کی طرف نکلنے سے پہلے نماز فجر کی ادائیگی کے لیے یہاں جمع ہوتے تھے۔ مولانا صاحب نے درس ختم کرتے ہوئے اختتامی کلمات کہے ”اور اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ قدرت نے جب جس سے، جہاں، جو کام لینا ہوتا ہے..... اسے کسی نہ کسی بہانے وہاں پہنچانے لے جایا جاتا ہے۔ وہ کہتے ہیں نا..... جب جب، جو جو، ہونا ہے، تب تب، سو سو ہوتا ہے.....“ مجھے حیرت کا ایک جھٹکا سا لگا..... بالکل ایسی ہی بات عبداللہ نے تب کہی تھی جب میں زہرا کی تلاش میں دوسری مرتبہ درگاہ آیا تھا۔ سبھی نمازی ایک ایک کر کے پیش امام صاحب سے مصافحہ کرتے ہوئے مسجد سے نکلتے گئے۔ میں نے بھی اسی روایت کی تقلید میں انہیں سلام کیا اور واپسی کے لیے قدم مسجد کے دروازے کی جانب بڑھائے ہی تھے کہ دفعۃً پیچھے سے پیش امام صاحب کی آواز ابھری ”عبداللہ بیٹا..... تم زرار کو..... مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے.....“ میں نے ان جانے میں فوراً پلٹ کر ان کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا کہ جیسے وہ ”عبداللہ“ ہی سے مخاطب ہوں، لیکن میری حیرت اس وقت دو چند ہو گئی جب مجھے یہ بتا چلا کہ ان کا مخاطب ”میں“ ہوں۔ مجھے زندگی میں پہلی مرتبہ کسی نے سلطان بابا کے دیئے ہوئے نام سے پکارا تھا، لہذا میرا چونکا تو فطری تھا، لیکن انہیں کیسے علم ہوا کہ میرا نام عبداللہ ہے۔ وہ میری حیرت کو بھانپ گئے اور مسکرا کر بولے۔ ”تمہاری حیرت بجا ہے۔ دراصل بچھے عبداللہ نے جاتے ہوئے خود مجھے بتایا تھا کہ اس کا کوئی دوست اس کی جگہ لینے آ رہا ہے اور سلطان بابا نے اس کا نام بھی ”عبداللہ“ ہی تجویز کیا ہے..... آؤ..... یہاں بیٹھ جاؤ.....“

میں ایک حیرت آمیز الجھن لئے، ان کے سامنے بیٹھ گیا۔ عبداللہ نے مجھ سے تو کبھی ان کا ذکر نہیں کیا تھا۔ پھر یہ صاحب میرے بارے میں اس قدر تفصیل سے کیسے جانتے تھے۔ میرے دل میں کئی سوال مچلے، لیکن میں احترا مانا چپ رہا۔ پھر انہوں نے خود ہی باتوں کا سلسلہ جوڑا۔ ”میرا نام مولوی خضر الدین ہے۔ گزشتہ کئی برسوں سے اس مسجد کی امامت کر رہا ہوں۔ تم سناؤ..... کیسی گزر رہی ہے..... کوئی تکلیف تو نہیں ہے یہاں؟“ ”نہیں..... ایسی کوئی خاص تکلیف تو نہیں ہے..... ایک آدھ دن میں عادی ہو جاؤں گا، اس ماحول کا.....“ ”ہاں میاں..... عادت پڑ ہی جاتی ہے..... بات بس خود کو ڈھالنے کی ہے..... تم نے اپنے گزر بسر کے بارے میں کیا سوچا ہے..... درگاہ میں کچھ کھانے پینے کو بھی موجود ہے کہ نہیں.....؟“ ”مطلب یہ کہ عبداللہ نے انہیں کافی تفصیل سے میرے بارے میں بتا رکھا تھا۔“ ”جی..... کچھ سامان عبداللہ چھوڑ گیا ہے..... ایک آدھ دن گزارہ ہو جائے گا..... پھر سوچوں گا کہ آگے کیا کرنا ہے۔“ ”نہیں میاں..... آج کا کام کل پر کیوں چھوڑتے ہو..... میری مانو تو آج ہی سے کام

پر لگ جاؤ۔۔۔۔۔“ مولانا صاحب مجھ سے باتیں کرتے ہوئے ایک آدھ بار اٹھ کر مسجد کے اندر ہی بنے اپنے حجرے میں بھی گئے اور پھر کچھ ہی دیر میں مسجد کے چھوٹے سے کمرے میں چائے کی سوندھی خوشبو پھیلنے لگی۔ ان کے حجرے کا ایک دورازہ مسجد کے اندر دینی کمرے میں بھی کھلتا تھا اور کچھ ہی دیر میں وہ ایک چھوٹی سی ٹرے میں ایک چائے دانی، دو کپ اور شاید رات کی بچی ہوئی روٹی کے کچھ ٹکڑے لیے چلے آئے۔ میں ان کے اس اچانک تکلف پر کچھ ایسا بوکھلایا کہ جلدی میں کچھ کہہ بھی نہیں سکا اور بس ”ارے۔۔۔۔۔ ارے۔۔۔۔۔“ ہی کرتا رہ گیا۔ مولوی خضر ہلکے سے مسکائے ”بھئی تمہیں تو شاید یہ پسند نہ آئے۔۔۔۔۔ پر ہمارا تو روز کا یہی ناشتا ہے۔۔۔۔۔ آج تم بھی گزارہ کر لو۔ کل سے اپنی پسند کا بنا لینا۔۔۔۔۔“ میں نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا۔ ”آپ اپنا ناشتا خود ہی بناتے ہیں۔۔۔۔۔ میرا مطلب ہے کہ۔۔۔۔۔“ ”ہاں میاں۔۔۔۔۔ چھڑا بندہ اپنا سامان خود تیار نہ کرے تو کیا کرے۔۔۔۔۔“ وہ ہنس کر بولے ”اکیلا رہتا ہوں۔۔۔۔۔ شادی وغیرہ کے جھیلے میں نہیں پڑا۔ ماں باپ عرصہ ہوا، اللہ کو بیارے ہو چکے۔۔۔۔۔ اب تو خود اپنا بھی چل چلاؤ ہے۔۔۔۔۔“ ہم چائے پیتے ہوئے باتیں کرتے رہے۔ ”ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ تم چاہو تو آج ہی سے اپنا کام شروع کر سکتے ہو۔ ابھی کچھ دیر میں نیچے ساحل پر سیپوں اور گھونگھوں کا بازار لگے گا، تم پچاس روپے کی چھوٹی نا کارہ سیپیاں خرید لینا اور پھر قریبی بستی کے اتوار بازار میں بیچ آنا۔ اس روز وہاں زائرین کا بھی خاصا ریلہ ہوتا ہے۔ تمہیں ضرور بیس پچیس روپے کا فائدہ ہو جائے گا اور اتنے پیسے تمہاری روزانہ کی گزر بسر اور درگاہ کے چراغوں کے تیل کے لیے کافی ہیں۔“

میں غور سے مولوں صاحب کی بات سنتا رہا، لیکن بنیادی مسئلہ تو یہ تھا کہ اس وقت میرے پاس سیپیاں خریدنے کے لیے پچاس روپے بھی نہیں تھے، کیوں کہ مجھے سلطان بابا کی شرط کے مطابق گھر سے بالکل خالی ہاتھ درگاہ آنا تھا۔ غالباً مولوی خضر میرے اندر کی ہچکچاہٹ محسوس کر گئے۔ ”کیا ہوا۔۔۔۔۔؟ گلتا ہے، تمہارے پاس پیسے نہیں ہیں۔ بھئی یہ تو کوئی بڑا مسئلہ نہیں ہے۔ ایسا کرو تم مجھ سے ادھار لے لو۔۔۔۔۔ پر یاد رہے۔۔۔۔۔ جیسے ہی تمہاری پہلی کمائی ہو۔۔۔۔۔ یہ ادھار لوٹانا ہوگا۔۔۔۔۔ بولو منظور ہے۔۔۔۔۔“ میں کچھ ہچکچایا۔ ”لیکن اگر مجھے اس سودے میں نقصان ہو گیا تو۔۔۔۔۔ میرا مطلب ہے، آپ رہنے دیں۔۔۔۔۔ میں کچھ نہ کچھ بندوبست کر لوں گا۔۔۔۔۔“ حالانکہ میں جانتا تھا کہ میرے پاس پیسوں کا بندوبست کرنے کا اور کوئی بھی ذریعہ موجود نہیں، لیکن نہ جانے کیوں مولوی خضر کی محنت کی کمائی کو داؤ پر لگاتے ہوئے مجھے کچھ ہچکچاہٹ سی محسوس ہو رہی تھی۔ لیکن انہوں نے زبردستی پچاس کا نوٹ میری قمیص کی جیب میں ڈال دیا اور مسکرا کر بولے ”ارے بھئی ادھار کے نام سے تذبذب میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔۔۔۔۔ اچھا چلو۔۔۔۔۔ قرض حسنہ ہی سمجھ کر رکھ لو۔۔۔۔۔ اگر نقصان ہو گیا تو قرضہ معاف۔ ویسے ان پچاس روپوں میں بڑی برکت ہے۔ دیکھ لینا تمہیں فائدہ ہی ہوگا۔ اچھا چلو، آج میں بھی تمہارے ساتھ ہی ساحل تک چلتا ہوں۔ تمہارا پہلا دن ہے۔۔۔۔۔ کہیں خراب مال ہی نہ اٹھا لو۔۔۔۔۔“ مولوی خضر نے برتن سینے اور میرے ساتھ چلنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ میں نے ممنونیت سے ان کی جانب دیکھا۔ ”آپ کیوں میرے لیے اتنی تکلیف اٹھاتے ہیں۔۔۔۔۔ میں خود ہی چلا جاؤں گا۔“ لیکن وہ بھی اپنی دھن کے کپے نکلے۔ فٹ تیار ہو کر سر پر امامہ باندھے، مجھے ساتھ لئے، نیچے ساحل پر بیٹھے ٹھہروں کے ٹولے کے قریب پہنچ گئے، جو ذرا سا سے فاصلے پر اپنے سامنے تازہ سیپوں اور گھونگھوں کا انبار سجائے بیٹھے تھے۔ مولوں خضر نے نہایت انہماک اور کافی بھاؤ تاؤ کے بعد سیپیاں خرید لیں۔ ساتھ ہی وہ مجھے اچھی سیپوں کی خصوصیات اور پہچان بھی بتاتے رہے، تاکہ آئندہ ایسے کسی سودے میں مجھے